واجدہ تبسم
افسانے

افسانے
واجدہ تبسم
تقسیم کار
"مکتبہ فسانہ"
۲۱۶ دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

بار اول ۱۹۶۸

تعداد اشاعت ۵۰۰

طابع اسرار کریمی پریس

ناشر واجدہ تبسم

قیمت ۳/-

اپنی بے حد پیاری

عقیلہ آپا

کے نام

جن کی اچانک موت نے زندگی کو بے پناہ

اداس کردیا ہے

فہرست

نقش حیات

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے کئی سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میری برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے، کیوں کہ جہاں تک محنت کا سوال ہے، میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت یا کاوش کا کوئی سوال ہی نہ اُٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ہلکا۔ میں آپ سے بتاؤں (، اگر میں افسانے نہ کہتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یہ کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور احساسات جب ایک ایک کر کے نفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مر سکوں گی۔) یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مر سکوں گی"، جیسے سیدھے سادے جملے میں جتانا چاہ رہی ہوں۔ "اب میں ایسی مانی ہوئی فنکار ہو گئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مر گئی تو کیا ہوا، میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا۔!" جی نہیں، ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی ہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے؟ ویسے جی چاہتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤں کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افسانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تلوار سینے پر لٹک رہی ہے، اب گری کہ اب گری۔

یہ اتنے سال اسی دھک دھکاہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تلوار کب گر جائے اور یوں قصہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی، مگر سخت جان ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجیے کہ "بھئی واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا؟ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں لگایا جا سکا ہے؟ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا اور میں نے مان بھی لیا، لیکن اس ایک لفظ 'بزدل' کے پیچھے جو ایک لمبی چوڑی داستان چھپی ہے، اسے سن کر آپ کیا فیصلہ کریں گے۔؟

کئی کئی بار مجھ سے میرے حالات زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری افسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ ٹوٹالتی گئی، سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کہتی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کریں گے کہ حق پر کون تھا؟ لیکن اب جب کہ اپنے حالات زندگی اور افسانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھی ہوں تو بڑی طرح ہنسی آ رہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالات زندگی۔! اور پھر افسانہ نگاری۔؟ حالات زندگی ہی تو کمبخت ایسے تھے جنہوں نے افسانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔ مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راز بھی کھول دینے پڑیں گے جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں، آنسو بن کر آنکھوں میں مچلتے رہے ہیں اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حساب لے کر ہی رہیں گے۔

اپنی چھاچھ کو کوئی گوالن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم نقاد ہوں جو کبھی جانب داری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سامنے یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا سازگار تھا؟ اگر میں یہ جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھا دیں گی۔ پھر میں سچائی سے کام کیوں نہ لوں؟ میرا گھرانا، سیدوں کا وہ گھرانا تھا۔ (جی ہاں صیغۂ ماضی کیوں کہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ" ہو کر بزرگوں کی ناک کٹا ڈالی ہے۔) جہاں پردے کی سخت قید و بند تھی اور لڑکیوں کی کسی قسم کی آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ حد یہ ہے کہ میرے ابّا نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں" تین سال کی عمر میں جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر چچا نے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں داخلہ مل گیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، کیوں کہ اس طرح تو ہماری نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتے؟) اور وہ حسب ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بہنوں میں جو بہن تیسرے نمبر پہ تھی، وہ بڑی ذہین اور ذرا خود سر قسم کی تھی۔ اُسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اُسے نہ آتی تھی مگر قصے کہانیاں پڑھنے کا اُسے وہ شوق تھا کہ پوچھیے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا تھا۔ مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ ہوتا گیا۔

اُن دنوں ہمارے یہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔ 'شمع' سے لے کر 'جالستان'، 'آریہ ورت' اور 'کامیاب'، تک۔ اور اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لے کر ے تک چاٹ جایا کرتی۔ جنون یہیں پر ختم نہ تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا تھا وہ میرے لئے سب سے بڑی دلچسپی تھے۔ میں وہ سارے کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہا کرتا ساری دنیا کا علم گھول کر پی جاؤں۔ جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں اب، یعنی ایم۔ اے ہو کر بگھار سکتی ہوں، اُن دنوں میں چوتھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصوّر اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہئے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تمنا رکھتی تھی، چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آ رہی ہوں، ابھی میں نے آپ کو اپنے "حالات" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کو، یعنی حالات زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں والی کتابیں خرید لاؤں۔ مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا، دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی کتنی ہی تمنا کریں ہاتھ نہیں آسکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ (کہتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے۔) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ ابا شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ، مگر میں بچپن سے سنتی آ رہی ہوں کہ انھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا ۔۔ کمایا بھی اور گنوایا بھی۔ اور جب مرے، میں

اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔! امی کی بات نہ پوچھیے، وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جہیز میں ڈھیروں سونے کے علاوہ پانچ گاؤں ساتھ لائی تھیں۔ نانی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ " اگر میں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا ہوتا تو میری چاروں نواسیاں اور بہوئیں سونے میں پیلی رہتیں۔ (ہم آٹھ بہن بھائی ہیں) مگر نانی اماں نے تو ایک ماشے کا تار بھی اٹھا کر نہ رکھا۔ یہ گھپلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا، مگر آج تو ہر ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے۔ پہلے میری امی مریں۔ (اس وقت میں ایک سال کی تھی) اس کے دو سال بعد میرے ابا بھی چل دیئے۔ (اچھے لوگ تھے بے چارے، جو ہر فکر سے آزاد ہوگئے) مگر ہم آٹھ بہن بھائی نانی اماں کے لئے پرابلم بن گئے۔ میں نے ابھی آپ سے بتایا ہے نا کہ میرے ابا بہت فضول خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی، امی کا جہیز بھی گنوایا۔ قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا کہ ساری دولت چپ چپاتے غائب ہوگئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت کا کیا حشر ہو جاتا جو برسوں سے " خاندان سادات " کے سر پہ تاج بن کر جگمگاتی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا نا کہ ابا مرے تو کفن بھی دوسروں نے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی تو ظاہر ہے سب رشتہ دار سناٹے میں آگئے اور ایک ایک کر کے کھسکنے لگے۔ (رشتہ دار ناک بھوں نہ چڑھائیں میں تو صرف اپنی کہانی سُنا رہی ہوں) جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار بہنیں اور چار بھائی تھے جنہیں سوائے نانی اماں کے اور کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔

نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں روپیوں پر چلتی تھیں۔ (یہ مبالغہ نہیں افسانوی تراشن نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلیوں میں بے حساب روپے ہوتے اور انھیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے ٹھونس دیا جاتا۔ اب وہی نانی اماں رہے سہے زیور کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم تربیت کر رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینوں کا بیسہ بھی آجاتا تھا اور یوں زندگی گزر رہی تھی۔ بڑی بے رنگی اور بے دلی سے۔ عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے تھے اور اپنے اپنے بستے لٹکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کیمپ والی سیمنٹ روڈ پر سے جب ہم مڑتے تھے تو لال گرجا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر ہری بھری بیل جھومتی تھی جس میں سرخ کے پھولوں کے بے حساب گچھے لٹک رہے تھے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دو رویہ قطار دور

تک چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین ہمارے وہاں سے گزرنے کے ٹائم تین چار بچے ہنستے، اچھلتے، پردے ہلاتے ڈرائنگ روم سے باہر آتے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے ان کی آیا، ساروں کے بستے سمیٹتے فرنٹ سیٹ میں بیٹھ جاتی اور کار زوں زوں کرتی یہ جا وہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑاتی اور وہ خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا اور سیمنٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی

بھر خوشی کے لئے روتا رہا"

تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ صورت حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناطقہ بند تھا۔ کبھی نہ کبھی ایک آدھ بہن بھائی اڑ جاتا:-

"میں تو انڈا کھاؤں گا"

"اوں اوں ــ میں تو گھی شکر کھاؤں گی۔"

نانی اماں کہتیں: "گھی شکر؟ یہ کون بڑی بات ہے! مگر بچو میں تو گھی شکر چوہے سے مانگ کر لایا کرتی ہوں، اور اس چوہے کو بچے بہت ناپسند ہیں۔ بس تم اوپر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو۔"، ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے بیچ بیچ رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھایا ہوتا تو اصلیت بھانپ جاتا، مگر ہم تو بیچ بیچ ہی بچے تھے پتہ نہیں کیسے، بہت دنوں بعد، ایک دن یہ بھید کھل گیا کہ وہ چوہے ماموں بے حد فراڈ تھے کمبخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ پتہ نہیں کتنا پانی اور شکر ہم گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انھوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ "اچھی بیٹیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں۔" اور یوں بھی ان کی تنبیہ جاری ہی رہتی تھی کہ الا بلا نہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ منا ہی ابھی ظلم نہ بنی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔

ہماری ماما غائب ہو گئی۔ کھانا پکانے کی سخت مشکل جا رہی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا

کرتیں کہ "ایک ماما لادو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں"۔ مامائیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجکٹ کر دی جاتیں۔ ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں میتھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں۔ بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرنے بیٹھے تھے، بہنیں پڑھ رہی تھیں اور میں شطرنجی پر سر نیہوڑائے، پنسل منہ میں دبائے، بہت انہماک سے بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ماما کو بھجوایا۔ نانی اماں حسب معمول جرح میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے یوں ہی ایک بار سر اٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے اِدھر اُدھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا:۔

"تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے۔"

"مرد تو چار سال ہوئے مر گیا۔"

میں نے لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا، کاپی بند کی، پنسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آکر بڑے معتبر انداز میں بولی:۔

"کیوں جی تمہارا مرد تو مر گیا۔ پھر یہ بچہ کہاں سے آیا؟" (میری عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی۔)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا کہ نانی اماں اکدم بھیچک رہ گئیں۔ پہلے تو انھوں نے دیدے پٹ پٹا کر اپنے نواسوں کو دیکھا، پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا:۔ "اور پڑھنے دو اسے رسالے۔"

میں اکدم چکرا گئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پر غور کیا تو کوئی برائی اس میں نظر نہ آئی۔ میں ابھی سراسیمہ سی کھڑی ہی تھی کہ نانی اماں گرجیں:۔

"آج سے تیرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں....."

میری سمجھ میں خاک نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں بھائیوں سے الجھنے لگیں۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سائڈ میں رہتے تھے۔ اگر کبھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے:۔ "نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکئے۔ بہت ذہین ہے۔ آگے چل کر یہ خود بھی کہانیاں لکھے گی۔" اب نانی اماں انہی کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے چل کر کیا ہوگا؟ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے، مگر میں رات گئے تک بستر میں ساکت و صامت لیٹی رہی۔ میری سمجھ میں پھر بھی نہ آیا کہ میں نے ایک جملہ میں کون سا گناہ

کرڈالا تھا؟ (اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ بچپن میں ہم کس قدر بے باک ہوتے ہیں۔!)

اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہوگئے۔ اور میری خوشیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا۔ پڑھنا۔ بس پڑھنا۔ اب یوں ہونے لگا کہ جہاں میں نظروں سے اوجھل ہوئی نانی اماں نے پکارنا شروع کیا:۔

"وہ بدذات کدھر ہے؟ وہ مردار کہاں غائب ہوگئی؟۔"

میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا ناکہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ اپنی قبر پر کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ پھول دفن ہے جو بھری بہار میں مُرجھا گیا۔"

میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں۔ جس بات کو آپ بھول کر بھی مائنڈ نہ کریں، میں اسی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی فطرت اور عادت ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلایا ہے مگر پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ پہلو پسند ہے، میں جیتی ہی اس کے سہارے ہوں۔ (ایک دن میں یوں ہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ قصور میرا تھا بھی نہیں۔ وہ میرے پیر تلے آگئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پیر ہٹایا تو وہاں میری ہوئی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک ملول رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا دانہ بھی تو نہ تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا؟)

اب مجھے اپنے سایے سے بھی ڈر ڈر کر چلنا پڑتا تھا۔ میں جہاں بھی تنہائی پاتی فوراً اُدھر کا رخ کرلیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تین منزلہ، اِدھر اُدھر بڑے بڑے آنگن، برآمدے، دھابے، کافی جگہیں ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑھ سکتی۔ مگر اس دن کے بعد مجھے بہت کم موقعے ملتے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہوسکتی۔ میرے ایک بھائی تھے، سگریٹ کے شوقین، ان کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ نانی اماں کے ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرتے کہ خود کو رضائی میں وہ بالکل چھپا لیتے اور اندر مزے سے سگریٹ دھونکتے رہتے۔ (ان کی اس چوری کا راز یوں کھلا تھا کہ مہربان نے ایک بار نئی رضائی جلا ڈالی تھی) ایک دن میں نے غور سے اُنھیں دیکھا اور خود بھی اس ترکیب پر عمل کرنے لگی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ اس طرح سر سے پیر تک خود کو ڈھانک لینے سے ایک تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسرے "کمرے" میں اندھیرا بہت ہو جاتا تھا اور الفاظ نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لئے ٹارچ کا انتظام کیا تھا۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ رضائی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی ہٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جانے لگی تو انجام

ظاہر ہے۔ مگر ایسی ویسی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توہین تھی۔ میرا ذہن نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں دیکھ ڈالیں اور بس معاملہ ختم۔ مگر میں گھر والوں پر یوں پوز کرتی تھی کہ جیسے میں بڑی بکش ——— (BooKisH) بڑی ہی پڑھاکو ہوں جب دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا۔) میں کرتی یہ تھی کہ کورس کی کتابوں یا کاپیوں میں اندر ناول اور رسالے رکھ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں۔ مگر میں تو دوسرے ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں سے بہت سے یقین کریں بھی نا) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی ناول پڑھا کرتی۔ بدبختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک رسالہ کاپی میں چھپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں نے یوں ہی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی تھی، اچانک ہوا کے ایک جھونکے سے اُڑ کر دور جا پڑی اور رسالہ نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان بھیا نے یہ واردات نانی اماں سے جا بتائی۔ نانی اماں نے اتنا مارا، اتنا مارا کہ میرا بیہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام !!

میں اُن دنوں زندگی سے سخت بد دل ہو رہی تھی۔ انہی دنوں مجھ پر ٹائیفائیڈ کا شدید حملہ ہوا۔

میرے ابّا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں اگر کبھی نکل جاتے تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے۔ امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا، بال لمبے لمبے تھے مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں کہ آنکھوں کا اجالا گالوں پر پڑتا تھا۔ میں نے تو اپنی امی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں بس کہانی کی خیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں! ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ جیسے کچھ بھی نہ تھے، مگر شاید میری بدنصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں معمولی میں تھی۔ اور مزید ستم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آ رہی تھی۔ تندرست اور نک سک سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں بھی تھی جس کا رنگ سانولا تھا، جسم دبلا پتلا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال

اور کبھی کبھی آنکھیں قد کی مناسبت سے بال بہت ہی لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیل یا کالی بلی کہہ کہہ کر ستایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عمروں سے محبت نہ پاکر میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کتابوں کو بنایا تھا۔ (یہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی۔)

بیماری جھیل کر اٹھی تو اور زیادہ چڑچڑی اور زود رنج ہو گئی۔ احساس دگنا ہو گیا۔ زندگی تلخ ہو گئی، میں آپ سے بتاؤں، ان دنوں کتابوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی ــ!

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ میں جی لگایا۔ اس طرح لامحالہ میں کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیاں بہت خوش رہتیں۔ میں نے اپنی ذہانت سے ایک ناجائز فائدہ یہ اٹھایا کہ مس سے یہ پرمیشن حاصل کر لی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری ریڈنگ ہمیشہ سے بے حد فاسٹ ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ مس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا ــ! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی ــ معصوم مسرت ــ!

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے۔ غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کیسے کیسے جواز ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درد کی شکایت کی تو نانی اماں نے جھٹ کہہ دیا:-

"پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے"

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے "میرے چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں" تاکہ خوب پڑھ سکوں! سیمنٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار چکر کھاتی نکلتی تو دل کو پختہ یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انھیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ یہ تک یاد نہیں کہ کسے موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی!

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوند دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔

کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر حیدرآباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب و غریب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ستم کچھ اور بھی ہو گئے۔

اب ہم بہنوں نے مڈل اسکول پاس کر لیا تھا۔ بھیا لوگ کالجوں کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھرواں جوڑا تھا۔ ۶ تولے کا۔ ۶۰ تولے کی کوئی حقیقت نہیں ـ نانی اماں نے جب ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی۔ مجھے یاد ہے ہر بار جب سر تلے کر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کرتیں تھیں تو ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا، مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں ـ
کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زیور بھی نہ تھا جس کو توڑ تاڑ کر اخراجات پورے کئے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زمینات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمینداری سسٹم لاگو ہوا تو وہ زمینات بھی حکومت کے بھک میں چلی گئی ـ !
(سنتے ہیں زیور سنگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زیور تو سارا رہن رکھنے یا توڑنے کے کام ہی آیا!)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امراؤتی سے حیدرآباد دکن تک کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے میں کس قدر بوڑھی ہوں۔! اس کا احساس سوائے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے ـ ؟ حیدرآباد آکر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گزارتے آرہے تھے ـ!! مصیبتیں کیا ہوتی ہیں؟ اس کا پتہ یہاں آکر چلا۔ ہمارے پاس کھانے کو اناج نہ تھا پہننے کو کپڑے نہ تھے، رہنے کو مکان نہ تھا، پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتابیں خریدنے کو پیسے نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیئے جاتے۔ اُن دنوں میں نویں کلاس میں تھی۔ کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بدنصیب ـ!!

حیدرآباد آکر سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم ہو کر رہ گیا ـ لائبریری کے قوانین بہت سخت تھے ـ
ایک لڑکی کو صرف ایک کتاب ملتی۔ وہ بھی ہفتہ میں ایک دن اور لائبریری میں اس قدر اچھی اچھی کتابیں تھیں ـ!!

اے زر تو خدا نیست ولے

نویں کلاس میں ایک لڑکی تھی ۔ اپنی آنکھوں، لمبے بالوں، سانولی رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بھر میں وہ 'بنگالی مینا' کے نام سے مشہور تھی۔ اُستانیاں پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔ قریبی سہیلیاں اُسے "بلبل" کوئل کہہ کر پکارتیں۔

وہ خوش آواز پرندہ میں تھی ۔! میں نے اوروں سے اپنے بارے میں بہت سُنا تھا لیکن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی پر بیٹھی بے دلی سے کچھ گن گنا رہی تھی۔ میرے بازو والے ڈیسک پر ایک لڑکی بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی ۔ مجھے گُن گنا تا سُن اُس نے کتاب بند کر دی اور کہا :-

" واجدہ ذرا زور سے تو بھی گاؤ ۔"

میری نگاہ کتاب سے جا کر ٹکرائی۔ وہ منشی پریم چند کا ناول "گئودان" تھا۔ میں نے ذرا جھجھک کر کہا :-

" ایک شرط پر ۔"

" کون سی شرط ؟" وہ حیران ہو کر بولی۔

" میں تمہیں گانا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب پڑھنے کو دو گی ۔"

شرط ایسی کوئی کڑی نہ لگی اُسے۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سُنایا ۔ "نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی ۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل ۔ "کسی کو ہم نہ روئیں جو ....." کتاب میرے ہاتھوں میں تھی ۔ !!

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا۔ کیونکہ اس طرح گانا سنا دینے سے میرا کچھ نہ بگڑتا تھا اگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں۔ پانچویں، چھٹی، ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا پٹنے لگا۔ جتنی کتابیں میں نے ان دنوں پڑھیں، ان کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ دنیا اتنی وسیع ہے، کتنے ہی رائٹرز گزرے ہیں جنہوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے، میں نے کیا پڑھا ؟ کچھ نہیں، کچھ بھی تو نہیں۔ مگر اپنے ناساعد حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اُس پر فخر کرتی ہوں ۔ (حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اُٹھایا ہے)

پھر پولیس ایکشن ہوا ۔ بھرے شہر میں بھگدڑ مچی ۔ ایک بھیا پاکستان چل دیے ۔ ایک

نگے ہی فارن میں تعلیم حاصل کرنے چلے گئے تھے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ خاندان کے بچھڑے ہوئے لوگ ٹوٹی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھرے جارہے تھے۔ نہ دماغی چین تھا، نہ جسمانی آرام۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول سے اُٹھا لیا گیا۔

"کیا میں یوں ہی جاہل رہ جاؤں گی؟" یہ سوال رہ رہ کے میرے مجروح دل اور دماغ کو کچوکے دیتا۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن ہی سے اتنا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گڑیاں اور ہنڈکلھیا کھیلا کرتیں میں محلہ کے بچوں کو لے کر اسکول لگایا کرتی۔ پھر اللہ میاں کا یہ ستم کیسا تھا؟ نانی اماں سمجھاتیں :۔ "بیٹا تم لوگ سیدھو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو اُسے پیارے ہوتے ہیں!"

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنج وقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر یوں محسوس ہوا گویا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔ "دیکھ لیا نا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور سر جھکائے جاتے ہیں۔"

نانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خدا کو برا کہا انھوں نے کان پکڑوا کر توبہ کروائی اور گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو "نا انصاف" کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

بس فیس میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آنی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر۔ چلئے قصہ ختم۔ میٹرک، پھر الیف۔ اے، پھر بی۔ اے اور اب ایم۔ اے سب پرائیوٹ۔ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ کبھی ایک مہینے تک کے لئے کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا، دل سے پڑھا۔ امتحان دیا، پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجالائے۔

الیف۔ اے کا امتحان جیسے دیا، دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتابیں تھیں، نہ کھانے کو تھا۔ ان دنوں راشن سے چنے اور پکی ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے، ہم۔ پیسے کہاں سے لاتے؟ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کتابیں بھی نہ مل سکتی تھیں۔ معاشیات کا پرچہ تھا۔ جو لکھا تھا آج بھی یاد ہے۔ سوشیالوجی کا پرچہ بھی یوں ہی کیا۔ پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو گالیاں۔ ایک آپا قریب سے گزریں اور سوشیالوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا، ہنس کر بولیں :۔

"کمیونسٹ ہو گیا؟"

میں جل کر بولی تھی ۔۔۔ " تن پر کپڑے نہ ہوں، پیٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں ننگا ہوں، بھوکا ہوں اور آپ اسے کمیونزم کہتی تھی تو بے شک میں کمیونسٹ ہوں ۔"

نتیجہ آیا ۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی !!

(وہ نام نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے، کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا ۔) میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں تنی ہوئی دکھائی دیں) بی ۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا " اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے ۔ اکنا مکس MAIN لو تاکہ کچھ قدر بھی رہے ۔" بہکاوے میں آ گئی ۔ جس وقت کو سچن پیپر بانٹنے کی بیل بجی اور پروفیسر نے کہا:۔

" جس جس کا اکنامکس میں ہو کھڑی ہو جائیں " تو پورے ہال میں صرف ایک لڑکی کھڑی تھی ۔ وہ بھی ایک پرائیوٹ کینڈیڈیٹ ۔ اور وہ میں تھی ۔

یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی پہلی تعلیمی شکست ۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی ۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات لئے تھے ۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی ۔ مگر اس میں کیا میری اپنی ذہانت کا قصور تھا؟ مجھے تو ڈھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی ۔ پڑھنے والے بھلے ہی یقین نہ کریں، مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے ؟؟ دوسری بار پھر بی ۔ اے میں بیٹھی ۔ پھر لڑھکی ۔ میرے خدا ! " مجھ میں بہت ہمت ہے ۔ کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کروں گی اپنی ۔" میں نے دل کو اپنے سنایا ۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر صرف ایک جوڑا ہوا کرتا تھا ۔ بھائیوں کی قمیص، پتلون چمن، میم صاحب بنی، وہ جوڑا دھوتی اور پھر امتحان دینے مرنے سے " دھلی دھلائی ساڑی پہن کر جاتی ۔ غریبی کے داغ کس نے دیکھے ہیں ۔ ؟؟

اچھی طرح یاد ہے، صبح پرچہ تھا، رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سوئے تھے ۔ اچانک وطن سے بھائی آ پہنچے ۔ یہ بھائی بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں ۔ آتے ہی کہا:۔

" بڑی بھوک لگ رہی ہے، کھانا لاؤ ۔"

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چھت کو دیکھتی پڑی تھی ۔ ان کی بات سن کر میں نے چہرہ بھی رضائی میں چھپا لیا ۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے، پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے ۔ باہر سے آئے تو ہاتھوں میں کیک پیسٹری اور سالٹی اسنیکس کے پیکٹ تھے ۔ میں

نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولیں۔ اُنھیں کھلا پھندا دیکھا تو بھرے سوگئی۔ صبح میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ میرا رنگ سانولا ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد چاند ہو رہا تھا۔

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا، پاس بھی ہو گئی۔ زندگی کی کافی بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی، مگر دل کو جیسے گھن لگ گیا۔ زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی، مگر افروز (میری چھوٹی بہن — میری دوست۔) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں "لمبے بالوں والی وائجہ" کے نام سے مشہور تھی، جھڑ جھڑ اکر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی اور وزن دن بہ دن گھٹنے لگا۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے صاف کہہ دیا:۔

"اگر بیٹیا کے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک خطرناک گھاٹی میں جاکر ختم ہوتا ہے۔" نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا "مرغی کے پوزوں کا سوپ پلائیے۔ پھل دیجیئے۔ دودھ پلائیے — اور — اور — اور —" اب میں آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانک اور گولیاں لکھ کر دیں۔ غذا کے بعد۔ مگر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ٹانک غذا کے بعد لوں یا پہلے۔ ان دنوں ہمارے یہاں کبھی کبھار ہی کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ وہ ٹانک اور گولیاں بد قوں پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں، افروز اور آپی مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے وہ ٹانک اور گولیاں پھینکی ہیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جو اتنے ہی دنوں سے دل کو چھیدے ہوئے ہیں۔)

ان ہی دنوں دلی سے ایک ویکلی "آئینہ" شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا "میری یادداشت ہے" اس کے تحت کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ اپنی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔ میں نے بیٹھے بیٹھے ایک دن یوں ہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انٹر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی لفظوں میں بیان نہ کر سکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے، جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پر لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں،

جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آ رہی ہوں آج ٹھنڈے سائے تلے آگئی ہوں۔!!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دُکھ کے علاوہ بھی کئے واقعے اور حادثے ایسے تھے جنھوں نے میرے دل کو کرچی کرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انھیں لفظوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ اکیدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ ادبی ملقوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات سنا رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گنا رہی ہوں، مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا۔ اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ ماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے، تمتماتے بچے، جن کی تعلیم تربیت، دُکھ درد، اچھے بُرے میں بس نانی اماں ہی نانی اماں تھیں۔ کوئی کسی کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کروں کہ اُنھوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا؟ ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ۔ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے، اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کل کلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور بُری صحبت میں پڑ کر ناکارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ "دیکھا!؟ کیسے اولاد کی تربیت کی ہے۔؟" اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔؟ (نانی اماں خدا نہ تھیں مگر میں نے اُنھیں سجدے کئے ہیں!) تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ اب ادھر اُدھر جو دو چار میری کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آگیا۔!

"واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دے دی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں؟"

"اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"

"دیکھنا ایک دن باپ کی ناک کٹوا کے رہے گی۔"

"میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے۔ پہلے تو بات دبی دبی سی رہی، پھر زور شور سے میرے خلاف محاذ بننے لگا کسی سلسلے میں نانی اماں وطن گئیں، وہاں

لوگوں نے خوب کان بھرے ۔ واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں ۔

ان ہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی ۔ نانی اماں پرچہ لے کر آئیں اور ڈٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی ۔ بتا تو کیا لکھتی ہے ؟" ۔ کہانی آپ کے سامنے ہے، بتائے بھلا میں یہ کہانی سنا سکتی تھی ؟ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس کچی حقیقت کو کہانی کا روپ دیا ۔ اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی پھرتی ۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہ ہو گیا، بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً "ایسی ویسی" کہانیاں یہ لکھتی ہے، تب ہی تو سنا نہیں سکتی ۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود ۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آموجود ہوئیں ۔ "بتا کیا لکھ رہی ہے ؟ سنا کیا لکھ رہی ہے ؟" نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں، مگر انھیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے ۔ اگر میرے ہاتھوں میں لمبا چوڑا کاغذوں کا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی ۔

"خط اتنے بڑے بڑے لکھے جاتے ہیں ؟ ضرور کہانی لکھ رہی ہے"

اب مصیبت یہ رہی کہ ایڈیٹروں کے جو خط آتے اور جاتے، سب کچھ نانی اماں سنسر کرتیں ۔

محترمی ایڈیٹر صاحب

آپ نے کہانی مانگی ہے ۔ اس وقت تو نہیں ہے، جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی ۔

"کیا لکھا ۔ جب لکھوں گی !؟ مگر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے ؟؟"

پھر کسی ایڈیٹر کا خط آ گیا کہ کہانی مل گئی ۔ ارے کمبخت مل گئی تو اطلاع دینا کون ضرور تھا ۔

لیجئے اب نانی اماں سن رہی ہیں ۔

"کہانی مل گئی ۔ آپ نے کمال کر دیا ہے ۔ وہ دن دور نہیں جب آپ آسمان ادب کا سورج بن کر چمکیں گی ۔"

"یہ کہانی کب بھجوائی تھی ؟"

یہ کڑا محاسبہ ۔ ابخدا زندگی اجیرن ہو گئی ۔ میں نے دل کڑے، حالات سے سمجھوتہ کر لیا ۔ "اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی ۔ کون یہ جوکھم مول لے ۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے !"

کئی دن گزر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا ۔ ایک دن ایک ماموں تشریف لائے ۔ پامسٹری سے بڑا لگاؤ ہے انھیں ۔ میرا ہاتھ دیکھا پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے پھر سیریس ہو کر بولے :-

"اری بیج ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔ اور بہت سلامؔ"
میں نے آزردہ ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ " ماموں میرا دل نہ جلایئے۔ ہاتھ آیا تو موقع کھو گیا۔ اب کون شہرت کا ٹکٹ ہے۔"

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم بھول گئی اور ایک کہانی فوراً لکھ ڈالی۔ "آگ میں پھول" لفافے میں بند کر کے رکھ بھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر کے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے؟" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

وہ جھوٹ کیوں بولتا۔؟ صاف کہہ گیا:۔ ملکو بی بی نے کہت دیے۔ بولے غپ چپ ڈال کو آجا۔"

اس کمبخت "غپ چپ" نے وہ آگ لگائی کہ پوچھئے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آنگن میں آگ اور پھول بکھرے نظر آرہے تھے۔ میرے خدا !!

میں سہم کر رہ گئی ــــ بزدل لڑکی۔

پھر ایک پھوپھی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔

" اچھا تو اسی کا نام واجدہ تبسّم ہے۔"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جانے مجھ میں کیا ''لائق'' ہونے کے آثار نظر آئے کہا میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچّہ ماں کا زیادہ ہوتا ہے، باپ کا کم۔ امی کا رکھا نام چل نکلا۔ بگڑا تو کسی نے ملکو کہنا شروع کیا، کسی نے مکی اور کسی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلے کی نوبت آئی تو بابا والا نام لکھا یا گیا۔ "واجدہ بیگم" مگر جب میں نے لکھنا شروع کیا تو خود کو واجدہ تبسّم بنالیا۔ صاف سیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دئے، میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی، اور یہی کیا بھی۔ اس طرح خود میرے خاندان میں پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام "واجدہ تبسّم ہے"۔

باتوں باتوں میں "تین جنازے" کا ذکر آگیا۔ کہنے لگیں :۔

"یہ کہانی تم نے ہی لکھی ہیں نا"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی :۔ "جی نہیں وہ تو فکر تونسوی نے لکھی تھی۔"

جس زمانے میں شاہراہ میں وہ کہانی چھپی اُسے فکر صاحب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ گھبراہٹ میں جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پر نام تو تمہارا دیا ہوا ہے۔؟"

اب کہ میں بہت معتبر انداز سے جھوٹ نبھانے لگی:۔

"دیکھئے نا دراصل ہوتا یوں ہے۔" میں نے اس قدر اُلٹ پلٹ باتیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے بسی پر مجھی کو رونا آ گیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اپنی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی تھی دل کا سارا غبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا۔ جاتے جاتے جب وہ سمجھانے لگیں تو یہ بھی کہا:۔

"دیکھو بیٹا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو ...."

ابھی وہ کچھ کہتی ہی تھیں کہ اکدم واجدہ زور سے بول پڑی:۔

"کٹے گی تو میرے باپ کی ناک کٹے گی۔ آپ کا کیا بگڑے گا؟ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی اماں اکیلی رہ گئیں تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوجھی۔ اب ہم کسی قابل ہوئے ہیں تو آپ کیوں اپنا سکیت جتانے آن پہنچی ہیں؟"

وہ یقیناً میں نہ تھی، واجدہ تھی، جو ایک کہانی کہنے والی تھی، جو اپنے مستقبل کے لئے جدوجہد کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدل لڑکی ہوں۔ ہاں جناب! اس دل ڈول جھلکا، اور ایسا جھلکا کہ پھر کسی نے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے، وہ بھی جو کہنا چاہئے، اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہئے۔

(میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے کتنے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکے۔؟)

ایک بار ایسے ہی کسی موقعے پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیز سے کہا تھا:۔

"جی آپ تو آپ ہیں، اگر قبر سے میرا باپ اُٹھ کر آ جائے تو بھی میں افسانے لکھنا نہیں چھوڑوں گی۔"

یہ بڑی عجیب وغریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں کافی پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈرتے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی، اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ واجدہ تبسم! میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے۔ ہاں ہاں وہ واجدہ نا۔ میری عزیز ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔ اس کے باپ تو میرے

دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بیٹیا نے۔"

آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ ضرور آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے تنک مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہوں جو لوگ میرا نام لے لے کر فخر محسوس کرتے ہیں ان سے کہہ دوں:۔

"معاف کیجئے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"

پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں، مگر پھر بھی نانی اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگماں ضرور ہیں۔ انھیں ایک شکایت یہ ہے کہ میں انھیں اپنی کہانیاں نہیں سُناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ ہے بھئی اپنا بوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سُنا سکیں۔ ایک بار، بار بار کے کہنے پر، افردر نانی اماں کو کہانی سُنانے بیٹھی۔ اس میں لفظ محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گڑبڑا گئیں۔

"ہیں، کیا پڑھا؟ محبت۔ کس کو محبت۔ کس سے؟ اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں ___ ہوں تو یوں کہو۔"

اسی لئے کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں۔ ایک بے حد تاریک اور اندھیارے کونے میں۔ اگر آنگن سے ہو کر کوئی کمرے میں آئے تو دکھائی بھی نہ دے سکتا کہ کونے میں کوئی متنفس بھی ہے۔ بانو (جیلانی بانو) جب پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اُس نے وہ جگہ دیکھنی چاہی، جہاں بیٹھ کر میں "ادب تخلیق" کیا کرتی تھی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ ایسی واہیات جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے۔ مگر جب میں نے اُسے ٹوٹا ہوا پین، زنگ آلود چاقو، چھوٹی سی دوات، لال اودی پنسل کا ٹکڑا اور تازے آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرش پر بے شمار سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اُسے یقین کرنا پڑا۔ گھر جا کر اُس نے لکھا تھا:۔

"وجو جیدا۔

میرا مشورہ ہے کہ تم اس کونے سے نکل کر آسمان تلے آجاؤ۔ اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آجائے تو کیا کہنے!"

میں نے اس سے کہا تھا:۔

"میں کسی سورج کے مرہون منت نہیں ہونا چاہتی۔ میں خود سورج بن کر اس کونے

کو منور کر دوں گی۔" سورج بن جانے کی یہ تمنا میرے دل میں آج بھی موجود ہے۔ بانو کے علاوہ اور بھی بہتوں نے مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ میں صرف گھریلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ میری کہانیوں میں کوئی خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا میں اور بھی تو موضوع ہیں ۔۔!

یہ بات نہیں کہ مجھے عورتوں کا ایسی کہانیاں لکھنا پسند نہیں جن میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمیٹا گیا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال۔ یہاں کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کرنے والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں کہنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو، کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کیونزم یا کسی اور ازم کا پروپگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہو گی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے جب تک کہ آپ نے نئے متعلقہ سے گہری واقفیت حاصل نہ کر لی ہو۔ اگر میں یہاں حیدر آباد دکن میں بیٹھ کر کراچی کے غنڈوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی بھونڈی بات ہو گی! میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرنا چاہتی صرف اپنے متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر، مہالکشمی کا پل، ایسی کہانی بڑی خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے، کیونکہ اس نے نہ صرف بمبئی دیکھی ہے، بلکہ وہ مرد ہے اور اس نے باہر کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہو گی۔ کوئی بات ایسی نہ ہو گی جس کے متعلق کہا جا سکے کہ۔ "مسٹر آپ نے بمبئی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگاتے ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں؟" برخلاف اس کے اگر آپ کرشن سے پوچھیں کہ "بریانی میں کتنی سرخ مرچیں ڈالتے ہیں؟" تو یہاں ان کے "مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریانی میں مرچ تو پڑتی ہی نہیں ہے! کرشن بریانی نہیں پکا سکتا۔ میں مہالکشمی کے پل پر کوئی کہانی نہیں کھڑی کر سکتی، کیوں کہ ہم دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور پڑھنے والوں سے بھی، یوں بے ایمانی کر کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف انہی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے دل کو یہ دبکا بھی نہیں لگا رہتا کہ کہیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہیں۔؟

لوگ مجھ سے کہتے ہیں، "تم کب تک گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہوں گی؟ باہر نکلو۔ دنیا

ہیں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آجا کے وہی ایک سی باتیں ہیں۔" چلیے، مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر ذرا یہ بھی سنئے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم میں، ریل میں پہلی بار، ۱۹۵۶ء میں بیٹھی ہوں۔؟؟ پارٹیشن کے وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم حیدرآباد تک آ پہنچے، مگر جہاں تک ہوش و حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے! یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئے گا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ وہ لڑکی، جو خود کو بڑھیا، کہتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں بیٹھی ہو، وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے؟ کیا لکھ سکتی ہے؟ شاید ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ مگر بھیا کی شادی ناگپور میں ٹھہری، برات لے کر تو جانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے اندازے لگا رکھے تھے، لیکن جب دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی۔ "ارے باس اسی واہیات سی چیز کے اتنے ڈھنڈورے تھے؟ پلیٹ فارم الیا اور پلیٹ فارم ولیا، خاک بھی گلیمر نہ تھا کم بخت میں!" اب ریل میں بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جا رہا ہے۔ کیوں ریل پل پر سے گزر رہی ہے۔ کھڑ کھڑ دھڑ دھڑ کی وحشت ناک آوازیں!! اور مجھے ہر لمحہ یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔ قریب بیٹھا ہوا ایک کرسچین جھلا کر بولا:۔

OGOSH! The MOST COWARD CREATURE I'VEEVER SEEN!"

("اوگش۔ دی موسٹ کاورڈ کریچر آئیو ایور سین!")

جس لڑکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ ریمارک پاس کرتا ہے، اُس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے۔؟؟ نا بابا نا۔ یہ ہم سے نہ ہوگا ایسا کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب لکھ لیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن تھا تب تو نہ مرے، اب کیا مریں گے؟ اب تو جینے کے دن آ رہے ہیں۔

ویسے آپ یقین مانئے آپ میں سے کوئی میری کہانیوں کو بُرا کہتا ہے تو مجھے ذرا بھی دُکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری کہانیوں کو بُرا کہا ہے۔) اگر آپ اچھا کہہ دیتے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میں نے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے انھوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا

ہے۔ ایسے میں میں اس دکھ اور کرب کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے سے پیش آیا تھا! (میں نے آپ سے کہا ہے نا کہ مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں بھی ایک ہی SITTING میں لکھی ہیں!) "شہر ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب ہیں یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی میرا دل کیسے کیسے روتا تھا، پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا ہے کہ "ایسی کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی۔" (مگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون رلانے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک ہے۔"

"کالے بادل" لکھتے سمے میں جس کرب و امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ پیسہ کتنی حقیر شے ہے، مگر پھر بھی اس کو سجدے کئے جاتے ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا اور خود ہی ان کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے! ہم کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں PAGAN ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی تو۔؟؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بار خدا بن جانے کے بارے میں سوچتا ضرور ہو گا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ چوتھے ہی دن آسمان سے اتر آتی اور سیدھی سادی واجدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی اپنی جملہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے، جینا ہی پڑتا ہے مسکرانا ہی پڑتا ہے۔

تو میں یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے لکھنے میں محنت تو نہیں کرنی پڑتی، ہاں شدید کرب سے اکثر گزرنا پڑتا ہے۔ "شہر ممنوع" "گلستان سے قبرستان تک" "اُتّرن شہزادہ" — "کالے بادل" — "پاندان" "بیگناہوں کی پاداش" — "آگ میں پھول" یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں۔ کہانیاں نہیں جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔

۲۶ ستمبر پچپن کو میری پہلی کہانی چھپی تھی۔ اور اب تیرہ سال بیت گئے ہیں۔ ان تیرہ سالوں میں داد بہت ملی، "بے داد" کچھ نہیں۔ خودستائی نہیں کر رہی ہوں، لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ بھی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں، لیکن سوچتی ہوں ناکامی کی اینٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنائیاں اور مصیبتیں جھیل کر بڑھے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تر ہو جاتا ہے۔ اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی ہار نہیں مان سکتی۔

رہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہیئے۔ تو میں آپ سے بتاؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک پنچھی نے اڑنا سیکھا ہے، اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بے چارہ تھک کر زمین پر نہ آپڑے گا۔؟؟

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ "عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلوانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا۔" جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی فارمل ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں 'پیش لفظ' کی وبا بہت عام ہو رہی ہے مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑ رہی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی نہج سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے۔ اور یوں قاری کی بات جانے بھی دیجیے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی ناپسند ہے۔ بھئی آخر کیا ضرور ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی "بڑے آدمی" کے نام کا لیبل بھی ضرور لگا ہو! میں نے تو ان "راہوں" کو بھی روا نہیں رکھا ہے جو ڈسٹ کور پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چپکاری جاتی ہیں۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کئی "بڑے لوگوں" کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر جھوٹوں بھی "کچھ" لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے۔ لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ پیش لفظ دراصل

پڑھنے والوں کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے، اور مجھے چیپ قسم کی پبلسٹی سے ہمیشہ سے بڑی نفرت رہی۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اُسے چاہیئے کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے۔ کسی کا دیں بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑاتے قدموں سے خود ہی اپنی منزل کو پہنچوں۔ !!

واجدہ تبسم

ریلوے بلاک ۱۳۱۔ فلیٹ نمبر ۱۰
سانتا کروز (ویسٹ) بمبئی ۵۴
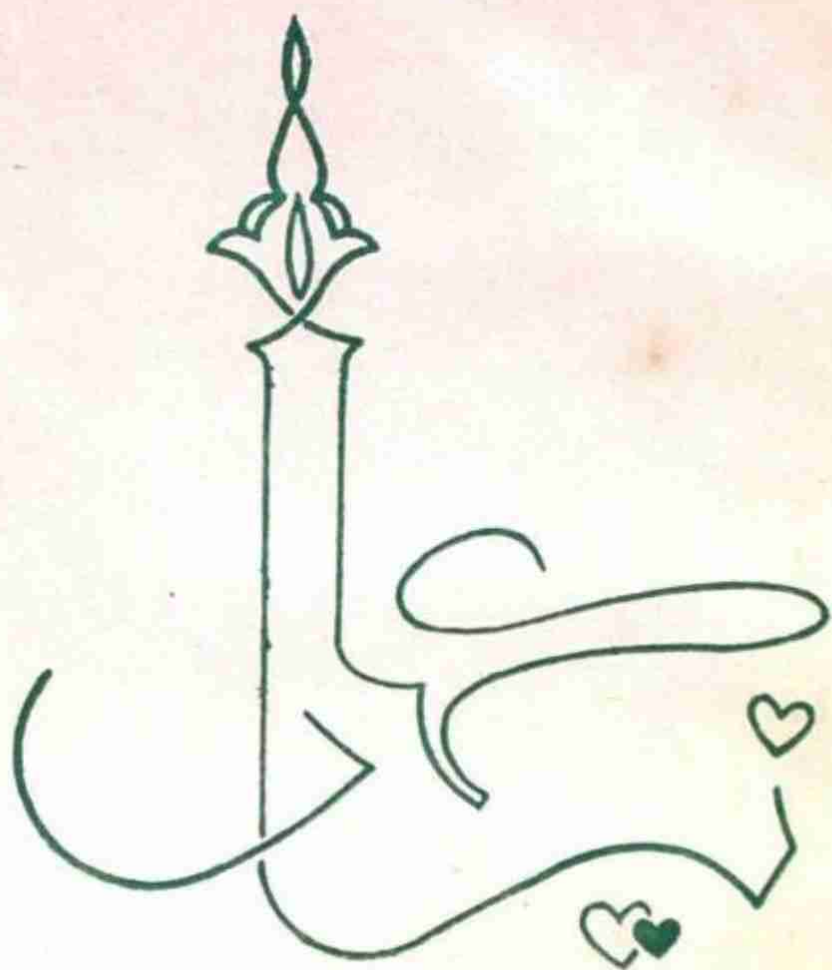
تہہ خانہ

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔
بڑے سے تھال میں گیہوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی گُمی لگا رہی تھیں۔ ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا بدن جھکولے کھا رہا تھا۔ کھڑے گلے کے کرتے میں سے گلابیاں امڈی پڑ رہی تھیں۔
راشد میاں کو شرارت سُوجھی، ایک کنکر اُٹھا کر پھینکا جو سیدھا ان کے گلے میں سے ہوتا ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔

" اے واہ، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی —!"

میاں اشارے سے بولے: "لاج کیسی —؟"

" ادھر اماں جان بیٹھی ہیں، نظر نہیں آتیں کیا —؟" انھوں نے اشارے میں جواب دیا
اب کے راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر بکھری ہوئی:—

"کیوں جی اگر ہمیں ...."

ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کو پچھواڑے کے دروازے سے دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچے داخل ہوئے۔ خوشی سے ان کے منہ تمتما رہے تھے۔ منّا وہیں سے چلّا کر بولا:—

" اجی اماں جی! اجی ابا جی! بلّی نے بچّے دیئے ہیں۔" شانو نے آواز میں آواز ملائی۔

"ہاں ابّا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔"

بے بی بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتی :۔ "ہاں ابّا چھک کے چھب گلابی گلابی ناک کے ہیں"

"سچ ؟" راشد میاں بھی بچوں میں بچّہ بن گئے۔

"ہاں، ہاں"۔ تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنا شروع کیا۔

"آپ خود چل کر دیکھئے ابّا۔ اتنے پیارے ہیں۔ ہم نے دور ہی سے دیکھا ہے، ورنہ بلّی تو نوچ ڈالے گی۔

راشد میاں کے چہرے پر بھی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔

"اچھا اچھا چلتے ہیں بھئی ؟ مگر جو بلّی مار بیٹھے ــــ ؟" بچّوں کو خوش کرنے کے لئے خواہ مخواہ کی بزدلی دکھا رہے تھے۔

"وہ نہیں مارے گی ابّا۔ ہم کوئی چھوٹے تھوڑا ہی ہیں۔"

"ہم تو ایک والا لے لیں گے۔ وہ جو پیلا پیلا ہے۔" ستانو نے سب سے پہلے قبضہ جمالیا۔

"اور ہم وہ کالے دھبّوں والا" ہاں۔ منّے نے بھی حق جتا دیا۔

"اور پھر ہم کیا لیں گے ؟"

"بلّی جو تمہاری ہے۔" راشد میاں نے فیصلہ کرنا چاہا۔

"ہش"۔ پھر وہ غصّے سے بولی۔ "اتی بڑی بلّی ہم نہیں لیتے۔"

آپس میں تُو تُو مَیں مَیں ہونے لگی۔ راشد میاں ہنس کر بولے :۔

"ارے بھئی ابھی سے تو نہ لڑو۔ ابھی انھیں ذرا بڑے تو ہو لینے دو۔"

ہنستے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا اُلجھا ہوا تھا۔

"ہونہہ ! کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بلّی کو بھی اسی وقت بچّے جننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کیسے ہیں۔ کہ بچوّں میں بچّہ بن جھٹ اُٹھ کر چل دیئے۔" ذکیہ بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے اُدھر سے برچھی چبھوئی۔ "اے میں کہوں اب روٹی پکے گی یا یوں ہی آٹا ملتی رہو گی۔ روٹی کی بجائے سویاں اتارنے کا تو ارادہ نہیں ہے ؟"

ذکیہ بی نے تلملا کر ساس کو دیکھا: "کبھی آپ لوگ بھوکے رہے ہوں تو کہئے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔"

میاں گودام سے لوٹے تو بچے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بے بی مارے اتراہٹ کے کندھے پر چڑھ بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر باپ کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں:۔

"اور اباجی نے اسے پکارا تو ہلی تک نہیں۔ پہلے تو موتی بولتے ہی بھاگی آتی تھی۔"

"اور ہاں ابا، شانو بولا، "آپ نے پچ پچ بھی کیا مگر وہ تو ویسی ہی بیٹھی رہی، جیسے اللہ جانے کون بلاتا ہو۔ کتنی بری ہے سالی!"

"ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے ننھے بچے۔"

باپ نے پچکار کر کہا۔

"تو پھر آئی کیوں نہیں؟"

"بھئی اب وہ ماں بن گئی ہے نا۔ اب اسے ہم سے زیادہ اپنے بچوں کا خیال ہوگا۔ اب وہ کیا ہماری بات سُنے گی بھلا۔؟"

میاں نے تو بچوں سے سرِ راہ یہ بات کہہ دی، مگر یہ تیر سیدھا ذکیہ بی کے دل میں جا کر اٹک گیا۔ پار نکل جاتا تو اتنی کلپ نہ ہوتی، مگر وہ تو وہیں چھدا رہ گیا۔ دھویں کے بہانے انھوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو ساس نے دیکھ لیا۔

"وہ ئی اپنی کوکھ تو بھرتی نہیں۔ موئے نااصل بلّی کتوں کا بھی حسد نہ چھوٹا۔"

بہو نے تڑپ کر ساس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تُرپائی کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سب کے سب پھر گودام کی طرف بھاگے۔ اور تو اور اب کے راشد میاں نے ذکیہ بی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلونگڑے ہیں۔"

ادھر سے اماں چلائیں: "وہ ئی کیا کام کے موئے! اُٹھا پھینکو۔"

"ارے واہ! اماں بی یہ خوب سُنائی آپ نے۔" وہ ہنسنے لگے، "بھلا اتنے اتنے ذرا ذرا سے، بلونگڑے مر نہ جائیں گے بی؟"

"اے! تو کیا گلے میں باندھ کر لٹکاؤ گے؟ ابھی چار دن کو بڑے ہوں گے تو جگہ جگہ گو موت

کرتے پھریں گے۔ خواہ مخواہ گندگی ہوگی ۔"

منا جھٹ بول اُٹھا: "واہ بلی گندگی کہاں کرتی ہے؟ بے چاری پہلے تو گڑھا کھودتی ہے اور پھر اس میں۔۔۔۔۔"

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی: "اے بیٹا! تو پھر بستروں میں سلاؤ، ہمارا کیا جاتا ہے۔"

"یہ اماں تو بس سدا یوں ہی کہتی پھرتی ہیں، چلو ڈکا۔" بچّے تو بچّے تھے، میاں بونگڑوں کو دیکھ کر یوں اچھل رہے تھے، جیسے سب سے چھوٹے بچے یہی ہوں۔

بونگڑے چپ چپ دودھ پی رہے تھے۔ بند آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ماں کی گرم گود میں گھسے جا رہے تھے۔ بلی یوں مطمئن تھی جیسے اب دنیا کی کسی چیز کی حسرت باقی نہ رہ گئی ہو۔

"ارے بلّی کے لئے دودھ لائیں ہم؟ بھوکی ہوگی۔" اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ طشتری میں دودھ لے آیا اور بلی کے سامنے آہستگی سے رکھ کر بولا:۔

"لے پوسی پوسی پوسی، لے پی لے۔"

بلّی نے بیچ بیچ سُن کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بند کرلیں۔

"شاید گرم چائے پر دل چاہ رہا ہوگا اس کا۔" اب کے تنا تو میاں دوڑ گئے چینی کی طشتری میں چائے لاکر اس کے سامنے رکھی اور بڑے پیار سے پچکار کر بولے:۔

"لے موتی، یہ چائے پی لے۔"

موتی نے مچھاتی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

"ہش۔ وہ تو پراٹھا کھائے گی۔" بے بی اندر دوڑ گئی اور مٹھی میں نرم نرم پراٹھا دبائے بھاگی آئی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا گھسیڑ دیا۔

پوسی نے حد درجہ ناگواری سے بے بی کو دیکھا۔ (کوئی طریقہ ہے کھلانے کا۔؟)

بچوں پر ذرا مایوسی چھا گئی۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابا۔"

ابا نے ہنستے ہوئے جواب دیا:۔ "وہ ماں بن کر ہر چیز سے بے نیاز ہوگئی ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔" بلّی نے آنکھ کھول کر سب کو دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا ہلی اور بچوں کو اپنے نیچے کرلیا۔ پہلے بونگڑے کی ذرا سی کمر نظر آرہی تھی، پوسی بڑی محبت سے اس کی

مگر کو اپنی زبان سے چاٹنے لگی۔ بچّے بد دل ہو گئے۔ پھر سے وہی سوال دُہرانے لگے:۔

"یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابّا؟"

"بھوک نہ لگی ہو گی"۔ راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب نہ سوجھ رہا تھا۔

"ارے واہ! بھوک کیسے نہ لگی ہوگی؟ روز تو جب پوسی پوسی کر کے بلاتے تو بھاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہو گیا؟ روز تو جب تب دسترخوان پر دھتکاری جاتی تھی اور آج تو کھانے کو سونگھتی بھی نہیں۔"

"ارے اسے گوشت کھلانا چاہیئے۔" منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں کچے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اُٹھائے آیا۔

"اب تو کھائے گی سالی!" اس نے جوش میں آ کر کہا۔

"پھر وہی گالی!"، راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ رہتے، مگر منے نے اپنی گرم جوشی میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ اور عین بلی کی بند آنکھوں کے سامنے ٹکڑا یوں یوں لٹکایا کہ ناک سے چھونے لگا۔

بلی نے ہلکی سی کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اُٹھی اور دوسری کروٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں بلونگڑے دوسری طرف سے دودھ ڈھونڈنے لگے۔

"آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی"۔ راشد میاں ہنس کر بولے:۔

"اب اسے بچّوں کے سامنے کوئی چیز نہیں بھاتی"۔

ذکیہ بی کو اپنا دل پہلو میں کٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کو انھوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گودام سے نکل گئیں۔

گھر کی ہنستی بولتی فضائیں جیسے رکاوٹ آ گئی، مگر صرف ذکیہ بی کی حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا اور گھر میں تو جب دیکھو تب پوسی اور بلونگڑے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچّے ہاتھ پکڑ کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچّے اسکول سے لوٹتے تو بستے بغل میں لٹکے ہی ہوتے اور بلی کا طواف شروع ہو جاتا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے گرہ پڑ گئی۔

"بچہ بھی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو۔ جانور کا ہو، سب اسی کو گھیرے

رہتے ہیں ۔ اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں پر غصہ آنے لگتا ۔

" محلے میں جس کو دیکھو گر پر کالا پیلا بچہ چڑھائے پھرتی ہے ۔ گھر بھرے پڑے ہیں اور کھانے کو دانا دکھانے تک نہیں ۔ خود میاں کو تین تین ہیں ۔ میری بھی گود بھر دیتا تو کیا جاتا خدا کا ؟"

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی محبت والے میاں تھے ۔ ذکیہ بی کی خالی گود پر انھیں کبھی اعتراض نہ ہوا ۔ ہوتا کیوں ؟ اللہ نے انھیں تو آل اولاد سے خوش ہی خوش رکھا تھا ۔ سونے آنگن کو تین تین بچوں کی چیخ و پکار خاصا آباد کر دیتی ہے ۔ مگر اس کا کیا علاج کہ عورت ہونے کے ناطے خود بی ذکیہ ہی ایک ننھے منے وجود کے لئے ترستی تھیں ۔ شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے ۔ مگر انھیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگی تھی ۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے لگائے پھرتیں ۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ پکار جیسے کانوں میں چھید ڈالتی ۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں ۔ خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں ۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے تھے، سمجھے کہ ہماری ہی ماں ہو گی ۔ مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پھٹکار نہ کرتی ۔ غصے کی حرکت پر بھی پیار کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی ۔ بھول سے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی ۔ ایڑیاں گھس گھس کر جو ضد کی پوری کر دی ۔ وہی اماں اب کیسی ہو گئی تھی کہ دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اتار لیتی ۔ کہاں تو وہ پیار دلار اور کہاں یہ روز روز کی پھٹ پھٹکار ۔ بچے ہی تو تھے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ ماں سے کٹے کٹے رہنے لگے ۔ دن بھر میں دو چار باتیں کر لیتے تو کر لیتے، ورنہ تینوں آپ ہی آپ روٹھتے بھی مننتے بھی ۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کر دی ۔ نہیں تو دادی کی جان پر ستم توڑنے لگے ۔

ساس بہوؤں کی آپس میں کبھی نہیں پٹتی ۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا ۔ اب یوں دیکھو تو پوتے بھی تھے اور پوتی بھی، اب کون ارمان بھلا ان کے جی کو لگا رہ گیا تھا ۔ مگر گھونگٹ بھی نہ اٹھا ہو گا کہ ساس نے بات بیچھے طعنہ دینا شروع کر دیا ۔

نہ کبھی ذکیہ بیگم کے دن چڑھے نہ ساس کی زبان رکی ۔ مہینے بیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو ۔ مگر وہ اسی پابندی سے نماز ناغہ کرتی رہیں

اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برساتی رہیں۔ اور اِدھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شانو اور بے بی کھٹکنے لگے۔

کہنے والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بی کے متلی اُٹھی، قے ہوئی اور چکر پر چکر آنے لگے۔ ہاتھوں پیروں کا دم ہی جیسے جاتا رہے پلنگڑی سے لگ گئیں۔ متلی چکر میں دنوں کا حساب بھی بھول گئیں اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے پھرنے لگیں، تو ساس نے دیدے گھما گھما کر دیکھنا شروع کیا۔ متلی چکر تو تھے ہی۔ چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا اور چال میں یہ بھکا بھکا پن! دن گزرے جا رہے ہیں اور بہو ہیں کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو بڑا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ بی تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پر گمان ہو ہی نہ سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سامنے ہی سامنے بڑھا چلا آنے لگا اور ہر اچھی بُری چیز کے لئے طبیعت للیانے لگی۔ کبھی کھٹے بیر ہیں تو کبھی تیز تیز مونگ کے بڑے۔ کبھی جواری کی باسی روٹی کے ساتھ اچار پہ طبیعت اُمڈ رہی ہے تو کبھی اودی اودی جامنوں پر۔

ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ ایسی آل کماونی کیسے ہو گئی ہے کہ ہر ہر چیز پر مرbھکوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ مگر ایک دن محلے کی دائی نے جو یونہی اماں جان سے گپ لڑانے چلی آتی تھی، یہ انکشاف کر کے کہ بہو بیگم کو تو پانچواں بھر رہا ہے۔ ذکیہ بی کے دل کے آنگن میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگے۔ دل کے کسی کونے سے آپ آپ صدا آنے لگی:۔

"سو جا رے میرے پیارے سو جا رے میرے بالے"

ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پر چلتی تھیں اور ہواؤں میں اڑتی تھیں ساری تیزی تندی، ساری بدمزاجی ہوا ہو گئی۔ وہی ساس کہ جن سے لڑتے جھگڑتے اِدھر کا سورج اُدھر ڈھل جاتا اب ایسی پیاری ہو گئیں کہ اماں جان ہیں تو سب کچھ ہے۔

" اماں جان کے دانتوں میں زور ہی کہاں ہے کہ بیچاری کچھ سخت گرم چبا سکیں۔"

کبھی ستریاں پک رہی ہیں تو کبھی نرم نرم گلتھی، کبھی چاولوں کے آٹے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ۔ بچوں سے بھی آپی آپ ملتی ہو گئی۔ جو چیز آ رہی ہے سب مِل بانٹ کر کھا رہے ہیں۔ بچّے بچے ہی ٹھہرے، اگّا میں نرمی دیکھی تو ادھر ہی ڈھلک پڑے۔ بچّے ماں کے آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ میاں سے تُو تُو، مَیں مَیں کی بجائے پیار دُلار کی باتیں ہو رہی ہیں۔ چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔ میاں تو بیچارے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے۔ یہ آپی اینٹھ جاتی تھیں۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا، کونے کونے سے مسرّت ٹپکی پڑتی تھی۔

چلّہ نہا کر اُٹھیں تو پھر گھر کے کام کاج گلے پڑ گئے۔ مگر اس میں بھی ایک لطف تھا۔ اِدھر اُدھر سے آ کر بچّے کا منہ چوم جاتیں، گود میں اُٹھا لیتیں۔ سینے سے لگا لیتیں، پیشاب کر دیا ہوتا تو پوتڑا بدل دیتیں۔ روئے نہ روئے آپی آپ بہلاتیں۔ مناتیں۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی ہانڈی، کہاں کی روٹی۔ ہانڈی جلتی ہے تو سو بار جلتی رہے روٹی کوئلہ بنتی ہے تو ہزار بار بلا سے بنتی رہے، جیسے ایسا لال! لاکھوں روپے وار پھینکوں۔

محلے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں اُترتا، بچّے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میوے کھا رہی ہیں۔ پھل چوس رہی ہیں، حریرے ڈھکوس رہی ہیں اور پھر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا نہ پھل کی خوشبو ہی سونگھی۔ یہ تک نہ جانا کہ حریرہ کیا بلا ہے۔

بچہ پلانے کو بیٹھیں تو لگتا کہ بس دو نہریں ہیں کہ اُمڈی چلی آ رہی ہیں۔ کیسا بہتوں دودھ تھا کہ دن بھر میں بچے کو چار چھ بار پیٹ بھر بھر پلانے کے بعد بھی تین چار کرتے بدلنے پڑتے۔ جب تک گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اُٹھتیں کہ بنا کھائے پیے ہی دھاریں بہہ نکلتیں۔ بچّے کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں۔ ساس کہہ کہہ کر مر جاتیں مگر حلق سے نوالہ نہ اُترتا۔

اچھا بُرا تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ کون جانے کس بات میں اُس کی کیا مصلحت چھُپی ہے۔ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلّی دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے، مصلحت سے ہی ہوتا ہے۔

گرمی کے دن تھے، بدن تھے کہ جھلسے جارہے تھے۔ اترتی دھوپوں میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی کے دانوں کے مارے جسم بھر بھر آگیا تھا۔ موٹا تازہ۔ گد گدا بچہ" پانی کے ٹب میں بیٹھا تو لگا چھپ کرنے کے چھپاکے اڑانے۔

بچے" کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے! ذکیہ کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا، گلزار کھلے جارہے تھے۔

"ووئی دلہن غضب خدا کا! ایسی چلچلاتی دھوپ میں کھلے آنگن میں بچے کو نہلائے جاتی ہو اور اتنی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے۔ دھوپ لگ جائے گی نا۔"

"اماں جان گرمی تو دیکھئے نا۔ جھلسا جارہا تھا۔ اب کیسا خوش ہورہا ہے۔"

"خاک خوش ہورہا ہے۔ نمونیہ ہوجائے گا، ہاں!"

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی:۔ "نمونیہ؟ اوئی اماں جان! بھلا دھوپوں کے دنوں میں نمونیہ ہوگا؟"

"تم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی؟ تمہاری بڑی نند کی بچی یوں ہی جاتی رہی، اچھی خاصی، کھیلتی مالتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہوگیا۔ مگر تم لوگ کسی کی مانو بھی۔ اگلے زمانے والوں کو تو تم نئے لوگ یوں ہی چٹکیوں میں اڑاتے ہو۔"

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید تولیے میں لپیٹ بچے" کو اٹھا لیا۔ اور راشد میاں نے روتے روتے سفید ململ میں لپیٹ قبر میں سلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہوگیا: ذرا سا منہ نکل آیا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، دل رہ رہ کے بس ہو ہو کئے جاتا۔ اپنے دیدوں دیکھتے، اپنے ہاتھوں ہو کو نہلایا تھا، سفید ململ میں لپیٹ کر موگرے کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ مگر ممتا کا مارا، بے کل جی چین پائے تو کیسے؟ کونے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں۔ کبھی چولہے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں۔ یہاں تو نہیں چھپ گیا؟ وہاں تو نہیں چھپ گیا؟ اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا؟ یہیں تو سویا تھا! ابھی کے ابھی میں کہیں چلا گیا؟ کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی گلابی دھبے تیر گئے۔ ہو پکارتے پکارتے ہونٹ

پیٹ پڑ گئے۔ مگر ہوکو آنا تھا نہ آیا۔ عمر بھر کے لئے کلیجے کو پھانس لگا کر چلتا بنا۔ ہو بہو ل تھا ذکیہ بی چمن۔ پھول گیا تو کیا چمن اور گیا چمن میں بہار! وہی دن تھے اور وہی راتیں۔ بات بات پر الجھ پڑتیں۔ پاگلوں جیسی حرکتیں کرتیں۔ کاٹنے کو دوڑتیں۔ بعد میں پھر کبھی تو گود ہری نہ ہوئی۔ ان کی قسمت میں اوپر والے نے ایک ہی پھل رکھا تھا۔ وہ بھی ادھ پکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے:۔

"ابا! ابا! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"اچھا؟" وہ ذرا بناوٹی حیرت سے بولے۔

"ہاں ابا! اور اب تو وہ ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلّی کا ٹھکانا آج کل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا۔ سات گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ نیچے ہی اپنی ٹیک لگائی۔ ذکیہ بی کے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا۔ بچّے باپ کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھکا جھکا کر رینگتے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا:۔ پوسی بڑے اطمینان سے دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹا بلونگڑا اس کی دم کے پاس پڑا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا۔

"ارے اس کالے دھبوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے ہٹا دیا؟"

راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

"میں نے" شنّو سہم کر بولا۔

"اور جو اس کی ماں اس کو اِدھر اُدھر ڈھونڈتی پھرے گی؟"

"وہ وہیں تو چپکا ہے ابّا، ذرا منہ موڑے گی تو آپ ہی دِکھ جائے گا۔"

"خبردار! جو بلونگڑوں کو کبھی ماں سے الگ کیا: وہ سارے میں چلاتی پھرے گی۔ ہاں سُن لو۔" راشد میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر تینوں بچّے سہم گئے۔

ذکیہ بی، جو توے پر روٹی ڈال رہی تھیں۔ روٹی کے ساتھ ساتھ اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں جل کر کوریا ہو گئیں تھیں۔

"خبردار! جو بلو بگڑوں کو ماں سے الگ کیا۔" ان کے کانوں میں بس یہی گونج باقی رہ گئی، "خبردار! خبردار! خبردار!"

رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا۔ جو میاں کا من بھاتا کھاجا تھا، مسور کی دال، چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیاں زیادہ پڑگئیں تھیں۔ سوسو کرکے کھائے جارہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا پیالہ سامنے بڑھایا:۔

"ایسا بھی کیا بس کھائے جارہے ہیں۔ ہٹائیے رکابی سامنے سے۔ ذرا سی کھیر تو لیجیے، ٹھنڈک پڑجائے گی۔"

"اہا کھیر!" راشد میاں خوشی سے بولے۔ میٹھوں میں کھیر پر دم دیتے تھے۔ پیالہ پکڑ جلدی جلدی چمچے چلانے لگے۔ زبان میں اس بُری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ بجھی نہیں۔ ابھی سُو سُو جاری ہی تھی کہ پیالہ پکڑ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"کہاں جارہے ہیں؟" ذکیہ بی حیرت سے بولیں۔

ہنس کر بولے: "ذرا پوسی کو کھلادیں تھوڑی سی۔"

ذکیہ بی ذرا بُرا مان کر بولیں: "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور بلّی کا چونچلا سوجھ رہا ہے۔ کھا لیجئے نا۔ آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے۔"

"بلی بھی تو پسند کی ہے۔ ایسا بھی کیا ہے۔ بیچاری نے دو دو بچے جنے ہیں، کچھ تو مال اسے بھی تو ملے۔"

باپ کے ساتھ بچّے بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ "ہاں ابا! ہم کھلائیں گے، ہم بھی کھلائیں گے۔"

ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکادی۔ "حلق سے اترے تب نا!"

لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر بلی چھا کر رہ گئی ہے۔ اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلو بگڑوں کے لئے گلوں میں ڈالنے کو پٹے سیئے۔ جن پر دو دو بیسوں میں ملنے والے چھنکنے گھونگھرو بھی ٹانک دیئے۔ سردیوں کے دن تھے، اس لئے راشد میاں نے ماں سے سفارش کی کہ بلّی کے لئے چھوٹا موٹا۔ پرانے دھرانے کپڑوں کا نہالچہ سی دیا جائے۔ پوسی سردی سے مر نہ جائے گی؟

بلی خالہ کے کیا ٹھاٹ تھے: مزے سے گدے پر لیٹی ہیں۔ ادھر پیلا بونگڑا ادھر کالا بونگڑا۔ گھڑی دو گھڑی کو پڑوسیوں کے گھر کی خیر خبر لے کر، گھوم گھام کر آتی ہیں، پھر پہلو میں بونگڑے ہیں اور ان کی زبان۔ پتلی سی زبان سے اتنا چاٹتیں کہ بونگڑے موئے گیلے گیلے ہو جاتے۔

باپ کی اجازت سے بچے بونگڑوں کو اٹھا کر دالان میں لے آتے اور گھر بھر کو تماشہ ہو جاتا۔ شانو اپنا گیند پھینک دیتا اور بونگڑے اس کے پیچھے لپک پڑتے بستر بچھائے جاتے تو بونگڑوں کو نئی شرارت سوجھ جاتی۔ چاروں، گدوں پر لوٹے پڑتے۔ دو چار کھروپنے جب تک بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جاتے نہ یہ مانتے نہ وہ مانتے میاں ہنس کر بتاتے:۔

"دیکھا ذکا؟ بدمعاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہولہان کر ڈالے۔"

ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا۔

"سب بلی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ دو گھڑی کو میرا بھی حال پوچھ لے۔" ذکیہ بی نے بڑے کرب سے سوچا۔

سردیوں کی راتیں تھیں، چٹاخے کی سردی پڑ رہی تھی۔ محراب میں نیچی لو سے قندیل جل رہی تھی۔ سب رضائیوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے آڑے سوئے تھے اور خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی۔

ذکیہ بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا، سبھی سو رہے تھے۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر تک، اور پھر پیروں تک سرکا دیا۔ ہولے سے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو مندی مندی آنکھوں سے بیوی کو دیکھ کر بولے:۔

"کیا کر رہی ہو؟"

"ایسے ہی پیاس لگی ہے۔"

میاں پھر کروٹ لے کر سو رہے۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اتر کر کھڑی ہوگئیں میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر

لیا کہ کہیں کچی نیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یوں ہی کھڑی رہیں۔ میاں خر خر کر رہے تھے۔

ذکیہ بی نے اطمینان کی سانس لی۔ پیچھے بیٹھ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ بلی کہیں سیر کو گئی تھی۔ دونوں بلونگڑے گادی پر خر خر کرتے پڑے تھے۔ ذکیہ بیگم کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انھوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پیاؤں پیاؤں" دھکا کھا کر دونوں نسھری مری آواز میں چلاّنا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگڑے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکّے سے ان کی نیند میں خلل آ گیا تھا اس لئے بیچ میں آنکھیں کھول کر انھوں نے ناگواری سے اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکیہ بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگڑے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں پھر تہہ کی ہوئی گدی کو لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی۔ پیچھے دیکھتی وہ آنگن میں نکل آئیں۔ کمرے میں نیم گرم سی فضا سے نکل کر باہر اک دم شدید سردی میں آکھڑی ہوئیں۔ مگر انھیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور ہنسی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہاری بلی کے بلونگڑے ہوں تو ہمیں دینا۔ پوسی تھی تو دیسی بلّی، مگر یہ بڑے بڑے جھالردار بال، گدگدے، نرم نرم، موٹے موٹے پنجے، بھاری بھرکم۔ بلونگڑے بھی ویسے ہی ہوئے۔ محلے بھرے میں بہت سوں کے دانت تھے۔

بیگم مرزا اس وقت ذکیہ بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

"اس وقت؟ خیریت تو ہے؟" وہ بوکھلا کر بولیں

ذکیہ بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدی نکالتے ہوئے کہا:۔

"کیا کہوں بہن؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے، روز سوچتی تھی لا کر دوں گی۔ مگر بچے اور ان کے باپ چھوڑیں تب نا! اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے پوسی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن! انہیں کہیں اندر ہی چھپا لینا نہیں تو پھر واپس لے بھاگیں گے۔"

بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگڑے چھین لئے۔

"ارے دونوں ہی!" ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی

" ہاں مجھے معلوم تھا بہن ! تمہیں بلیوں سے بڑا پیار ہے۔ اس لیے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلا ہے ایک بلی۔ اب نسل چلاتی رہو۔" ذکیہ بی نے گھرائی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔

بیگم نے اُن جانے میں ایک تیر چلایا :-

" ان کی ماں تو نامراد ہائے ہائے نہ مچائے گی ؟"

بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوجھا، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں :-

" بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا " بڑے مشکل سے وہ ہونٹوں تک ہنسی کو گھسیٹ کر لاسکیں۔

" اے بہن ! بڑے چھوٹے کی نہ کہو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے ...... "

ذکیہ بی نے ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا تھا : " تو بہن رکھ کہاں رہی ہو انہیں ؟ "

بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھرے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ " اس میں ایک گدیلا بچھوا دوں گی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا آتی رہے گی۔"

ذکیہ بی جب دسمبر کی کڑکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگمگ قدموں سے چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھپاک سے گر پڑیں۔

صبح سارے گھر میں ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔

بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ چنگھاڑ رہی تھیں۔ اور راشد میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت پوسی کی تھی۔ میاؤں میاؤں کرکے سارا گھر سر پر اُٹھا لیا تھا۔

بلو نگوڑے آخر گئے تو کہاں گئے ؟

بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے بیگانہ خاگینہ پکاتی بیٹھی تھیں۔

" بی بی سے پوچھئے آپا۔ ایک دن یہ اپنی سہیلی زرینہ سے کہہ رہی تھیں کہ بلو نگوڑے بڑے ہو جائیں گے تو ایک تم کو دے دیں گے۔" شانو بولا۔

"واہ وا! اچھے ہو جی تم" منا بے بی کی حمایت میں بولا،
"وہ بے چاری تو خود اتنا پیار کرتی تھی، چپ ٹالنے کو کہہ دیا ہوگا"
"دیکھیے نا بھائی جان" بی بی نے اپنا ایک حمایتی پاکر خواہ مخواہ بسورنا شروع کر دیا،
"ہمیں الزام دے رہے ہیں خواہ مخواہ"
"دادی اماں سے پوچھیے۔ وہ ہمیشہ بولتی تھیں کہ بوبگڑے گندگی کے دھن ہیں۔ انھوں نے تو کسی کو نہیں دے دیئے؟"
"خاموش رہو بے وقوف" راشد میاں نے منے کو ڈانٹ دیا۔
"بلی نہ کہیں اٹھا کر لے گئی ہو" راشد میاں تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے
"اے واہ! سات گھر تو اس نے پھرا دیئے۔ اب کہاں لے جاتی بھلا؟ رات میں نے خود چھپر کھٹ نیچے دیکھے"
اور انھوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔
"اور میں کہوں اگر خود ہی اٹھا کر لے جاتی تو یوں کلپ کلپ کر میاؤں میاؤں کیوں کرتی؟"
بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی، مگر راشد میاں کی کسی صورت تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر شک و شبہ سے بولے۔
"کسی بلے ولے نے نہ کھا لئے ہوں"
"سردی کے مارے دروازے تو سارے بند کر لیتے ہیں، پھر بلا آئے تو کدھر سے؟ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے"
ہر بات کا واضح جواز موجود تھا۔ پھر؟
"میاؤں ۔ میاؤں ۔۔ می آؤں"
بلی بری طرح چلا رہی تھی۔ رہ رہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی، گودام کی طرف دوڑتی، مودی خانے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گودی کو منہ سے کھینچنے لگتی جو ذکیہ بی نے جہاں کی تہاں پھینک دی تھی۔
"ڈکھیا کا صبر پڑے۔ جس نے بھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے"
اماں جان نے کلپ کر کوسا دیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں۔ بچے الگ رنگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات سمجھا رہے تھے اور اماں جان کوسنوں کی بھرمار کر رہی تھیں ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم ساس نے ان سے پوچھا:۔

"دلہن بیگم، تم نے کہیں دیکھے ہیں بلونگڑے؟"

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی:۔

"میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں، میں کیا جانوں؟"

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی، ورنہ وہ خاموش ہی تھیں۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملنے تھے نہ ملے۔ چار چار، چھ چھ منٹ کو باہر سے آتی اور چھپرکھٹ کے نیچے گھس جاتی اور ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی بی کا دل تھرا تھرا اٹھتا۔

"رانڈ دودھ کے مارے لوتھن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، میا محبت تو اللہ نے سب کو لگا دی ہے۔" اماں جان، جو سدا بلونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں، آج ماتا کی پکار کے آگے سپر انداز ہو چکی ہیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ لٹکائے آفس چلے گئے۔ اور اماں جان کا دل اس دن سیون میں نہ لگ سکا۔

لاکھ جانور کے بچے تھے، مگر دن بھر اچھل پھاند جو تھی۔ تاگے کی گھنڈی دیکھ پاتے تو اس سے اتنے نیچے چلاتے کہ وہ کھل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی دھول دھانی کرتے۔ اتنی پھینکم پھانک کرتے کہ سارے میں کترنوں اور تاگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں بوسی کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

دو بجے پوسی پھر آئی۔ پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مار کے نشان، منہ ایک طرف پھول گیا تھا، ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی، اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی، یوں جیسے روتی ہو۔

سب اپنی اپنی بول بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل میں رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ٹک ٹک سنتی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید رد عمل ہوا کہ دوپہری

سے انھیں سنسناکر بخار چڑھ آیا۔

ساس نے کانپتا دیکھا تو اٹھیں اور دالان سے اٹھاکر کمرے میں جا لٹایا اور رضائی اڑھا دی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دوسری بھی لا اڑھائی۔

بچے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دادی ہمیشہ کی طرح سیون نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولہے کی بجائے پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔

تنّا نو بڑی اداسی سے بولا: "بلونگڑے نہیں ہیں تو گھر کیسا لگ رہا ہے بھائی جان!"

منّا کچھ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لے کر رہ گیا، جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔

"ہائے اللہ! اپن نے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ تارا اور سورج۔ کیوں بھائی جان، وہ پیلے دھبوں والے بلونگڑے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا؟"

دکھے دل سے منّا بولا: "ہاں بے بی! سورج چلا گیا اور تارا بھی چلی گئی اور اب گھر کیسا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا۔" تنّا نو حیرت اور پریشانی سے بولا۔

بے بی کا ننھا دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت کچ کچا کر بولی:—

"اگر مل جائے نا تو ٹھاں سے بندوق مار دوں۔"

منّا غم سے بولا: "ہم تو پھر ان کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو ذرا۔ ایک دن کبھی ابّا دیر سے گھر پہنچتے ہیں تو دادی اماں کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

تینوں خاموش ہو گئے، مگر لگتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے بلونگڑوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔

"اماں کچھ پتہ چلا؟" راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں سے پہلا سوال کیا۔

اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا! "جس کے دل کو ماں کی ممتا کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھیا کرے۔ ایسا بھی کیا موا کوراپن۔"

اماں کا شبہ آجا کر بہو پر جا رہا تھا۔ "موئی نامراد زخموں سے چُور چُور تھی۔"

"کون چور چور تھا اماں؟" راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے وہی تمہاری بلی۔ جانے کدھر کدھر کھوجتی پھر رہی ہے کہ سارا منہ نُچا لائی۔ ناک

الگ سوجی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔"

"ہوں" ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپ ہی آپ راشد میاں کے حلق سے نکل پڑی۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔

شانو سرگوشی میں منے اور بے بی سے بولا:۔

" بھائی جان! او بے بی! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری بلّی کے بچّے......"

دل برداشتہ بے بی بولی:۔" اللہ میاں ہماری دعا کاہے کو سُننے لگے۔"

" سچ مچ" منا گھبرا کر بولا:۔ ایسا نہیں کہتے، گناہ ہوتا ہے۔

دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے بھاگنے لگے۔

" اے نامرادو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے؟"، پیچھے سے دادی اماں چلائیں۔

آنسوؤں میں نتھری بے بی کی بے بس آواز آئی:۔

" دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جا رہے ہیں۔"

رات کے نو بجے سردی اپنے زور پر تھی، ادھر ذکیہ بی کا بخار اپنے شباب پر تھا کہ وہ رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ، ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال اُلجھے اُلجھے۔

میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا:۔

" کیا کر رہی ہو۔؟"

" ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا باہر جاؤں گی۔"

" مگر اس وقت اتنی سردی میں؟ تمہیں بخار ہو رہا ہے نا؟"

" تو کیا ہوا؟"، وہ کانپتی آواز میں بولیں اور ہلتی جلتی دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔

دروازے پر اتنی رات گئے انھیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت سے بولیں:۔

" تم؟ ارے، یہ کیا حال ہوگیا ہے تمہارا؟ کیا بات ہے بہن؟ خیریت تو ہے؟"

وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں:۔" بلو نگوڑے کہاں ہیں؟"

" وہیں ہیں ـــ کیوں؟" پھر ہنس کر بولیں،" وہ تمہاری پوسی آئی تھی، شاید بچوں کی بُو پا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے ڈالتی تھی، سر پٹختی تھی۔ میں نے بھگا دیا۔ بہت ستانے لگی تو غفورے نے دو ایک پتھر ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سوجا اور ٹانگ

الگ لنگڑا گئی۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

"اور بلونگڑے؟"، ذکیہ بی نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"وہ موئے اُداس اداس سے ہیں۔ دودھ دیا بھی، مگر منہ تک نہیں لگا رہے ہیں

بڑی بڑی آوازوں سے رو رہے ہیں۔"

ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا: "کہاں ہیں وہ؟ ایک نظر دیکھ لوں؟"

"وہ بی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ یہیں تو ہیں۔"

مرزا صاحب کی اماں دالان کے کونے میں رضائی میں سکڑی، "سوسو، سی سی" کرتی پڑی تھیں، دونوں کو صندوق کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں:۔

"بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی! ماں کی گود کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اسی ایک لمحے میں ذکیہ دلہن بنیں، سوتیلے بچوں کی ماں بنیں۔ ڈائن، کلمُہی، جلی ماں بنیں، پھر موئی ماں بنیں، اور پھر اب ان کی گود خالی تھی —!

بیگم نے آہستہ سے ڈھکنا کھولا۔

"میاؤں — میاؤں — می آؤ — امی اُؤ — امی آؤ۔"

بو جب روتا تھا تو یونہی 'امی اُؤ' کہتا تھا۔

بخار سے سنسناتا جسم کانپ اُٹھا۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلونگڑے کو اُٹھا لیا۔ چونک کر بولیں:۔

"ارے دو ہی دن میں اتنے دُبلے کیسے ہو گئے؟"

دالان کے پرلے کونے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی:۔

"جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب محبت کا سوال ہے بٹیا۔ ماؤں سے بچے چھٹیں یا بچوں سے مائیں......"

ذکیہ بی کچھ نہیں سن رہی تھیں، بلونگڑوں کو اپنی چھاتی سے چمٹا کر بولیں:۔

"بس میں انھیں لئے جا رہی ہوں!"

بیگم مرزا کا مزاج جاتا رہا۔ " وہ کیوں بہن!"

مزے سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ چڑھ گیا۔

" اے واہ! خود ہی دیے اور خود ہی لئے بھی جارہی ہیں ۔۔ کیسی دوغلی زبان ہے بی تمہاری! کوئی یوں دو منہ کا سانپ پالتا ہے اپنی زبان میں؟"

دروازے سے نکلتے نکلتے، پیچھے مڑے بغیر تیز، مگر کانپتی ہوئی آواز سے بولیں:۔

" تم نے کبھی بچے جنے ہیں؟"

وہ بے تابی سے گھر میں داخل ہوئیں، بلونگڑے ان کی چھاتی سے چمٹے ہوئے تھے۔

" منے، سانو، بے بی۔ دیکھو بیٹو، دیکھو میرے بچوں ۔۔ یہ تمہارے کھونے!"

بُوا کر پوسی چوکس ہوگئی۔ گدی پر سے جھکولائے کر اچھلی اور بلونگڑوں پر ٹوٹ پڑی۔ دیوانہ وار چوم چاٹ کر انھیں گیلا کرنے لگی۔

تینوں بچے کسی اندورنی احساس سے متاثر ہو کر اک دم جاگ پڑے ۔" اہا تارا! ابا جی سورج!" نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بُری طرح چلانے لگے:۔

" اماں جی! ابا جی! یہ کہاں سے آئے؟ کہاں ملے؟ کہاں تھے؟" تینوں کے تینوں بلی اور بلونگڑے پاس پاس ناچ رہے تھے۔

ذکیہ بی کھڑی کانپی جارہی تھیں، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔

راشد میاں نے اُٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

" میں جانتا ہوں ذکا دو دن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔"

ذکیہ بی نے گھبرا کر میاں کو دیکھا، ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

" ہاں، جب تم بلونگڑوں کو لے کر جانے لگیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر چپکا بنا پڑا رہا۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بن ماں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔"

سہمے سہمے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

" میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کرسکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک تہہ خانہ ضرور ہوتا ہے، مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں مامتا کی مشعل

ضرور جگمگا اٹھتی ہے !"

"میں ۔ م ۔ م میں ......" جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔ جب میں پوسی کی پکار سنتی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور ماممتا یاد آتی تھی۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روتے دیکھا تو...... تو ...... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لئے ایک دوسرے کے وجود کس قدر ضروری ہیں۔ میرا دل پھٹ جاتا، میں یقیناً مر جاتی اگر میں ....."

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپ تھپایا۔

"تم جی بھر کر رو لو ذکا ۔ آج تمہاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے۔"

"مگر مجھے رونا نہیں آ رہا ہے ۔ انہوں نے بے بسی سے کہا اور بچوں کی موجودگی کا خیال کئے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپھک پھپھک کر رونے لگیں۔

••

ساتواں شہزادہ

خالہ بی یوں تو مرغی کے چوزوں کو دانا چگا رہی تھیں۔ مگر ان کا سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔

صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے اور منجلی بہو بلقیس کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سنجلی بہو کا کام بھی کیا تھا، جدھر نپٹیں سارا معاملہ چوپٹ۔ یوں کرنے دھرنے کا شوق تو بڑا تھا مگر کوئی کام گت سے نہ کر پاتیں۔ پچھلے چکّر میں دھوبی کو کپڑے دینے بیٹھیں تو اچکنوں اور قمیضوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ ہوتا کیا، اختر میاں کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے۔ وہ دھوبی کے گھر چلے گئے۔ دھوبی تھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا، مگر تیس ۳۰ روپیہ دیکھ کر اس کی نیّت بدل گئی۔ صاف، مکر گیا کہ میں نے دیکھے ہی نہیں، دیکھتا تو واپس نہ کر دیتا ــــ؟

خالہ بی کا غصہ بہو پر تھا اور بہو کا غصہ جیٹھ پر۔

"اے واہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے اُتارتے وقت اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیں۔"

"اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دیتے وقت ذرا جیبوں کا جھنکا ہی لے ڈالیں

مرد تو مرد ہی ٹھہرا، آخر عورتوں کا اور کام ہوتا ہے بی؟ اُلٹے غصہ دکھاتی ہو۔"
تب کی بات بہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھنکوا رہی تھیں۔ خالہ بی
الگ دیکھ رہی تھیں۔ اک دم بلقیس نے ایک اچکن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کرلی۔
جلدی جلدی گرہ کھول کر دیکھا۔ دو دو پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی پپنیاں
اور ننھے بچے کے منہ میں دینے کا ایک ربر کا نپل!

"اماں دیکھتی ہیں یہ کیا ہے؟" اُنھوں نے منہ میں ڈال کر زور سے ساس کے کان
کے پاس پپنی بجادی۔ "کیا ہے!" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلونے!"

"تو کیا ہوا۔؟ — خالہ بی جواری کے دانے آنگن میں پھینکتی ہوئی بولیں، "ڈھیر سالے
تو بچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہوں گے۔ رکھ دو وہاں میز پر۔"

"بات تو سمجھتی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے بھیا کی جیب سے نکلے ہیں — وہ چھوٹے بھیا پر
زور دے کر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہے؟ نکلے ہوں گے چھوٹے ہی کی جیب سے۔ پھر؟"
بلقیس جھلا گئی — "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی؟"

"جا چھوکری تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے اتنے سارے بھائی بھتیجے ہیں، کسی کے
لئے بھی لایا ہوگا۔"

"بھائی بھتیجوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، گرہ لگا کر کیوں رکھتے؟۔"
اب کہ خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ "دلہن تمہارا مطلب؟ میں اب بھی
نہیں سمجھی۔"

"اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کروں۔" وہ اُکتا کر پھر کپڑوں پر
پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اُس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے
اور یہ تو ہوتا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوبصورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا۔
(بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا) ملک ملک کی خاک چھانتا اور پھر شہزادی بدر کمال یا پھر شہزادی گل رخ
کو کھوج نکالتا۔ بڑی دھوم دھام سے راجدھانی کو لوٹتا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھنی ہوئی سلطنت

بھی دوبارہ حاصل کرتا آتا۔ بس چھوٹے میاں کا بھی عن و من وہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے، سب میں خوبصورت اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لاڈلے بھی۔ اوپر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہوگئی، مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے۔ عمر بھی بہت کہاں تھی، بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے۔

وضعدار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگادیں، بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ ماں باپ پیٹ کی اولاد کا بُرا کیوں چاہیں گے؟ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔ کوئی ماموں کی بیٹی کی نند، کوئی خالہ زاد بہن کی بیٹی، کوئی بھتیجی تو کوئی بھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی؟ ۔ مگر وہ جو ہر ماں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے کا سہرا دیکھ لوں"، وہی خواہش یہاں بھی اُبھری، بیٹی تو دیکھی بھالی ہی تھی۔ بڑی بہو کی چھوٹی بہن، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی جب بڑے بیٹے کی آرسی مصحف کے وقت لال لال اطلس کا جھم جھماتا جوڑا پہنے ایک چھوٹی سی لڑکی صندل کی کٹوری لئے اور آتے ہی الڑ بھنگے پن سے بولی :۔

"بھیّا! ہم آپ کے صندل لگائیں گے تو نیگ دیں گے نا آپ؟"

اتنی پیاری صورت، ایسی بھولی ادائیں کہ سارے لوگوں کی نگاہیں جیسے اس پر جم گئیں اور تو جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ مگر ادھر خالہ بی نے تو بس تہیہ ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اُسے بھی اپنے گھر کا اُجالا بناؤں گی۔ مگر بات اپنے دل ہی میں رکھی۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچّے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور پھر لڑکیاں تو یوں ہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں۔ کوئی سال بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ بڑی دلہن کے میکے سے بلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے۔ اب بہن بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کار نہ کاج، تقریب نہ جلسہ، یہ بیٹھے بٹھائے بلاوا کاہے کو آیا؟ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا ہی بولے :۔

"مجھے تو معلوم نہیں۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔"

دلہن تو کچھ نہ سمجھیں، مگر خالہ بی ہنسنے لگیں۔

"اے دلہن تم بھی بس پوری وہ ہو۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں، لڑکی ذات کا معاملہ ہے اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دو ڈھائی برس کی بٹیا کو؟ چلی کیوں نہیں جاتیں۔"

بات وہی نکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی، ماں باپ تو فکر مند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ پڑا۔ مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب ہوا اپنی ہوئی۔

اِدھر یکے بعد دیگرے سب بھائی دلہے بن گئے تھے اور بیچ کے دو بھائیوں کے منڈوے بھی ساتھ ساتھ پڑے، نکاح خوانی بھی ساتھ ساتھ ہوئی اور اپنی اپنی دلہنوں کو گود میں اٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔ اب رہے کون؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈ دلار کے تھے ہی۔ پہلے اور آخری کاج پر تو یوں ہی زیادہ دھوم دھڑکا ہوتا ہے، اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ ہنگامہ ہونا ٹھہرا۔

خالہ بی کو گیا اپنے بیٹوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ نا کریں؟ پوچھتیں پچھتیں بھی کیوں؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام بھجوا دیا۔ غیر خاندان کے ہوں، چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنے ہی گھر کی سی بات تھی۔ بقر عید کے بعد جواب بھی مل گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے پھول پہنانے اُنھیں مسند پر آ بیٹھنے کو کہا۔

"مگر کس تقریب میں؟" اُنھوں نے ہنس کر کہا۔

"اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہوگا کہ یوں اترا کر پوچھ رہا ہے۔"

چھیوں بھابیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ سنجلی بھابھی بلقیس ہنس کر بولیں:۔ "اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔"

سب ہنسنے لگے مگر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔

"مگر کاہے کی باری بھئی؟"

"اجی جناب اب آپ کے دولہا بننے کی باری ہے۔"

اِدھر قہقہے اُڑے اور اُدھر ان کا جی ڈوب گیا۔

"مگر — مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو؟"

"اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہو گئی شاید" اماں بڑے پیار سے ہنس کر

بولیں "یہ بھلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا؟ کیا ناکر دیتا—؟"

چھوٹے میاں نے منگنی کے پھول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دُلہوں پر ایسے موقعوں پر جو خوشی چھاتی ہے وہ ان کے چہرے پر دور دور تک نہ ملتی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں تو جواب دیں، ورنہ منہ پھوڑ کر تو بول نہیں سکتے۔

"بات تو ہو بھی گئی تھی، اب بیٹی اُٹھا کیوں نہیں لیتے؟"

ادھر بیٹے والے ایسے ملے تھے کہ سر پر مہینے گزرتے جا رہے ہیں، نہ ہوں نہ ہاں۔ اِدھر اُدھر سے پتہ بھی چلایا، مگر نہ کھلی۔ پھر بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریننگ میں اچھے ہوئے ہیں۔ ٹریننگ ختم ہوئی تو ملازمت کریں گے، پھر کہیں جا کر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کرنے کا پھر بھی طے نہ تھا۔

باپ کا بچوں پر وہ رُعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے ادھر اُدھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ کر منڈوے تلے بٹھا دیتے "بول بے قبول ہے لڑکی؟"۔ اور میاں جی کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹریننگ کے بوجھ سے یوں ہی سوکھے جا رہے ہیں، بس ڈھیل دے دی۔

"کام کا بار آ پڑا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گرہستی میں الجھا دیں تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا تو ہونے نہیں جا رہا ہے۔"

دیوروں، بھاوجوں کی محفل جمتی تو رنگا رنگی باتیں ہوتیں۔ سنجلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ اُنھیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالہ بی نے بلقیس دلہن کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ جب اُنھوں نے جا کر سنایا:۔ "اماں سُنا کچھ، چھوٹے بھیا تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا"۔ — اماں نے چونک کر دیکھا۔

"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا!"

"اے لو میرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے؟ چھوٹے میاں آپ ہی کہتے تھے۔ سو میں نے آپ سے کہہ دیا۔"

"مگر کوئی وجہ بھی ہوتی !"

"اب یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔"

"بات میں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔"

بلقیس بی ہنس کر بولیں :۔ "اماں کہانی والے شہزادے کی طرح وہ تو کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔"

خالہ بی بدک کر بولیں :۔ "کیوں بالو کیا کسی شہزادی سے کم ہے۔"

"اب تو وہی جانیں جو انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔"

بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک رہ جاتے۔

ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ ملازم باہر ہی سوتا تھا۔ اس نے بڑے دروازے کی کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آگئے۔ خالہ بی کو تو مانوس قدموں کی چاپ سن کر سونا دوبھر ہو گیا تھا۔ سر اٹھا کر بولیں :۔

"کہاں گیا تھا چھوٹے میاں ؟"

چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے :۔ "رات کا شو دیکھنے چلا گیا تھا۔"

"اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں ؟"

"بھول ہو گئی اماں بی۔ دوستوں نے گھیرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔"

خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جوان جی ہے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیرنے لگے۔ کریم ان کا یار غار بن گیا کہ وہ دبے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑھنی تھی۔ جمعرات کی رات خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیر خورمے اور سویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام کاج میں تو رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح ننھے بچے کپڑوں کے لئے غل غپاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری کرنی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گڑبڑ، پھر خود عورتوں کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی اپنی بچیوں کے ریشمی رنگین

اور بچوں کے گلابی نیلے کپڑے اور اچکنیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں کہ صبح صبح پھر گڑبڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر بھر میں رت جگا پڑا ہے۔ یوں ہی اپنے پیچھے دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر داخل ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھما دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں کہ اماں تو بن کشن پہ کھوپرہ چھیلتی بیٹھی ہیں اور بھائیوں نے مارے خوشی اور اودھم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

خالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر بولنے پر اتر آتیں تو پھر بولتے ہی چلی جاتیں اور پھر صبح عید کا دن تھا کہ برس کے برس یہ دن آتا ہے۔ اگر فضوں میاں منہ پھلا کر بیٹھے رہے تو غصے غصے میں ساری خوشی ملیا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے بجھانے کے اور بھی تو کئی دن ہوتے ہیں! بس اتنا ہی بول کر رہ گئیں : "اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا؟ دیکھ لو دو ڈھائی سے کم کیا بج رہے ہوں گے؟ اور پھر اپنے کھانے دانے کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں؟ روزہ کہاں افطار کیا تھا؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے :- "ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا۔"

"اتنی رات گئے تک؟" خالہ بی بی حیرت سے بولیں۔

"اور کیا۔ اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں، میں تو تب ہی چلا آتا تھا۔"

"اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھوپرہ گھسنے لگیں۔ کرچے ہوئے بن بیٹ کر انہوں نے تھال میں رکھ دیئے، اور خود جا کر سماوار سے ٹونٹی کھول دی اور وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہر جمعرات کی رات کو سوتے وقت لیٰسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ دے گئی۔ وضو بنا کر اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑ کر بولیں :-

"توبہ ہے ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانا نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا؟" منجھلی دلہن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارت کی وجہ سے بدنام تھے، یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جاتا تھا۔ الجھ کر بولیں :- "ابا میاں لے گئے تھے، بھلا بچے کیوں اٹھاتے؟"

"اور ابا میاں کیوں لے گئے تھے؟"

"یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے؟"

بلقیس دلہن بولیں:۔ "انھوں نے اپنا والا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دے دیا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتا تھا، اور گھر میں کلام مجید نہ تھا، سوا بامیاں نے کلام مجید دے ہی دیا؟"

"اچھا کیا، مگر اب میں کاہے میں تلاوت کروں" گردن اونچی کر کے دیکھا تو طاقچے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا، آواز دے کر بولیں:۔ "ارے چھوٹے ذرا یٰسین شریف تو اتاریو۔"

چھوٹے میاں آواز سن کر آ تو گئے تھے، مگر یہ بات سن کر وہیں رہ گئے۔ کنمنا کر بولے:۔ "میں باوضو نہیں ہوں۔"

"اے میاں تو سامنے ہی تو سماوار دھرا ہے، وضو کو ایسے کون گھنٹے لگتے ہیں؟"

منٹ بھر تو یوں ہی الوؤں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے:۔

"میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔"

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی ٹنگریاں دکھ دکھ گئیں۔ اوب کر اپنی بہوؤں سے بولیں:۔

"دوئی دیکھاری لڑکیو! میں یہاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور وہ موا ایسا غائب ہوا کہ پلٹا ہی نہیں۔"

بلقیس نے دالان والے کمرے میں جاکر کھڑکی سے مردانے میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خرخر کرتے پڑے سو رہے ہیں

آج خالہ بی کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ انھیں یاد آیا ابھی کچھ ہی دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی، خالہ بی بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی مگر گا نٹھے پڑے رہے۔ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بستر میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے۔ لاکھ لاکھ ماں نے خود خوشامد کی:۔

"ارے موے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اترتی ہے۔"

کس کی فاتحہ؟ کہاں کی برکت؟ وہ تو ہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اٹھے بھی تو پہلے غسل خانے کی خبر لی۔ نہا دھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آکر بولے:۔

"کھلایئے کیا پکایا ہے!" خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحب زادے رات کو پھر

دیر سے لوٹے تھے۔

بھابیوں میں بات جا پہنچی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جا پہنچیں۔

" اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بُری باتوں میں پڑ گئے۔"

خالہ بی کو بھڑک کر غصہ آگیا: " اے میں کہوں جوان بچہ ہے، گھر میں جورو نہیں بچہ نہیں، ایسے میں اگر گانا وانا سننے کہیں چلا گیا تو کیا بُرائی ہوگی؟"

" گانے والے کا نام زلیجئے اماں بی" منجھلی دلہن بولیں،

" صاف سیدھی طرح کہئے ناکہ کوٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے۔؟ راتوں کو گیارہ، بارہ، ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ چپ نام کر رکھا ہے کہ ٹریننگ لے رہے ہیں۔ ٹریننگ ہے نہ ورننگ۔ دوسری ہی ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

" ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا بہنا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لئے ہیں۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک نہا دھو نہ لیں نماز کے کمرے میں پھٹکتے تک نہیں ہیں۔ اسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہے تو کیا کہہ سکتے ہیں؟" عزیز میاں کی بیوی نے صفا سا سر پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چہل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے کپڑے، بچوں کی چیخم چاخ، خالہ بی کا نوکروں پر گرجنا برسنا، بیبیوں کے سنگھار پٹار۔ بس سارے گھر میں دھمک دھیا ہونے لگی۔ یہاں وہاں، اِدھر اُدھر بس دھائیں دھائیں مچ گئی۔

دسترخوان بچھا، پورا گھر آکر بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر روں کرنے سے بچے اور بگڑ بیل ہو جاتے ہیں۔ پیار دلار سے ہر ایک کو کھلا پلا رہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس نوالے ٹونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا کر ٹال ٹال گئیں۔

پھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نے جبر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اٹھ کھڑے ہو گئے " بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے اماں۔"

خالہ بی کے دل کو مستقل دھکدھکی لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بیوی کو بس آ جا کے یہی چھن تھی کہ گھر بھر کی صفائی کرتی پھریں۔ مہینے

پندرہ دن میں جھاڑو لے کر اُٹھتیں اور پورے گھر کو کھود ڈالتیں۔ صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں
کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اُٹھایا، پلنگ اُٹھایا، الماری جگہ سے کھسکائی اور
پھر جھاڑ جھٹک کرکے، ایک ایک چیز سینت کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری کا قفل رہ گیا
تھا۔ پٹ کھولا، جالے گچھے کے گچھے بھرے ہوئے، نیچے اوپر دھول ہی دھول۔
"توبہ ہے اللہ! اتنی گندگی میں رہا کیسے جاتا ہے ان سے؟" الماری کے خانوں سے
سامان اُٹھا اُٹھا کر نیچے رکھنے لگیں کہ خانوں کی صفائی ہو جائے تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ
جائیں۔ دیکھتی ہیں تو سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارنڈ کے تیل کی چھوٹی سی بوتل، پھر ادھر ادھر
ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور ننھی منی دو تین نیکریں اور بکر میں آگئیں۔
"ہائے اللہ! سارا سامان! جیسے کسی کی زچگی کی تیاری ہو۔" ان کی اپنی زچگی ہوئی
تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد منگوایا تھا، اور پھر یہ ارنڈ کا تیل؟ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں
الماری میں چھپائے ہوئے۔!
ایک ہی جھپاکے میں وہ دیورانیوں جٹھانیوں کے جھتے میں بیٹھی ساری روداد سُنا
رہی تھیں۔
"اور کیا ہم نے بچے نہیں جنے؟"
"وہی تو میں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بدکتے ہیں۔
"ڈال لیا ہے کسی لڑی بڑی کو اپنے گھر۔"
بات اتنی بڑھی تھی کہ بلکے بیٹوں والی بہوؤں کے بیٹوں میں نہ رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو
پھر بھی اپنا بیٹا ہی معصوم دکھائی دیا۔
"اے لو، حد ہوگئی! گھر میں بچے کچے ہیں ہی۔ خیال سے لے آیا کہ وقت پر کسی چیز کی ضرورت
پڑے تو جلد ہی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو۔"
"وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دے گا۔ ہاں۔"
دوسرے دن محض ساس کی چوم چوٹ پہ ذاکر میاں کی بیوی نے الماری کا پٹ کھولا
تو سب چیزیں غائب تھیں۔ مطلب یہ کہ حق، حقدار تک پہنچ گیا تھا۔
اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بہوئیں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری
پکڑتیں۔ کبھی جیب سے چینی نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربر کی چڑیا، کبھی مٹھائی تو کبھی نیل۔

خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر ادھر اُدھر جھانک تانک کرے تو برائی نہیں بلکہ قابلِ معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ سچ مچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیانے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پر رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ صاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے یہاں جا پہنچے اور بولے:۔

"بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔"

"بانو بہن!" پھوپھی بی حیرت سے چیخیں، "ارے میاں ہونے والی بیوی ہے۔ بہن بھانجی کا رشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا؟"

"نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؟ میں نے تو شروع ہی سے اسے اپنی بہن مانا ہے کیوں کہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق، بھائی پر لگتا ہے ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر بھائی کو دعائیں دیتی رہے۔"

پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا، سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے شمیم میاں، شہر میں تین تین دکانیں تھیں۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شریف خاندان کی کوئی بیٹی اٹھائیں۔ چاہے غریب ہی کیوں نہ ہوں۔ باپ مدت ہوئی مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود، جو بھی بیٹی بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی، صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انہوں نے پھوپھی بی کو ایسی لچھے دار باتیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہوگئیں۔ اے اب جس کو بھرے دل سے بھر منہ سے بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خون کے رشتے بہن نہ ہوئی مگر پھر بھی بہن کا مان ہی اونچا ہوتا ہے۔ یہ تو حرام کرنا ہوگیا اور پھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا ہے کہ بہن کو بھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں روسیاہ کر دینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچ نیچ سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو یوں مشہور نہ کریں ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بنتا کام بگاڑ دیں اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے۔ کسی کا گھر جلے۔ بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے گپتا گپتی شادی کی تیاری شروع ہوئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ

مہینے کو بڑی بہو میکے جاتی تھیں۔ اب کے سے جو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بھرے گھر میں ہلوں مچی ہوئی ہے، کپڑے گوٹے ٹھپے کا جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سُنار بیٹھا ٹھک ٹھک کئے جا رہا ہے۔

ادھر گودام میں اناج کی اُٹھا پٹک ہو رہی تھیں تو دیواروں پہ رنگ دار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا پتہ چلا تو ہک چک ہی رہ گئیں۔ مگر عقل سے سوچا تو پھر خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا؟ رات ڈھلے رات آنا، باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا، نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کا دھیان اور نہ ٹریننگ کے بعد بھی بڑے ملتے تو وہی تین چار سو کے میاں تو بارش ہوتی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا! ذاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے۔ پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے، پھوپی بی بھی مدعو تھیں چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب طے کر رکھا تھا۔ لپکا جھپکی میں بانو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کروا دیا اور وہ تھے کہ صحراؤں کی خاک چھانے بنا ہی مجنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹریننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے اور خالہ بی خوش پہ خوش تھیں کہ چلو خدا نے وہ دن بھی لایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے پھول کھلتے دیکھیں گے اب شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے نیلے رقعے نظر آئے تو خالہ بی نے بہوؤں کو آواز دی۔

بلقیس بی نے ایک رقعہ اُٹھا لیا اور بھچک ہو کر بولیں:۔

"ہائیں! یہ تو بڑے بھوپھا کی طرف سے ہیں۔"

"کس سلسلے میں مگر؟" خالہ بی چونک کر بولیں۔

"سلسلہ؟ سلسلہ یہی شادی کا۔"

"ہائیں؟" خالہ بی اور اچنبھے میں پڑ گئیں، "وہی بی کس کی شادی؟ کچھ آگے پڑھو گی بھی —؟"

صاف صاف تو لکھا ہے —" منجھلی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے پڑھنے لگیں: —

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب

عقد سعید نورِ چشمی سلمہا

شرکت محفل عقد و تناول طعام کا متمنی

حاجی عنایت علی خاں

زمیندار

بتاریخ ۲۷ر ذی الحجہ ۷۶	مقام: لال حویلی
روز پنجشنبہ بعد مغرب	حیدرآباد دکن

خالہ بی الجھ کر بولیں :- "اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا - کیا سُنا رہی ہو یہ؟

بلقیس دلہن کو غصہ آگیا - "لو بھلا میں ایسی نپٹ جاہل ہوگئی کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے - بھوبھا میاں کی دو ہی تو بیٹیاں ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو - اب بھلا وہ اور کس کی شادی کا رقعہ چھپوا سکتے تھے؟ اور پھر لال حویلی میں کون رہتا ہے۔"

"مگر لڑکا کون ہے؟ کیا پتہ ہمارا چھوٹے میاں ہی نہ ہو۔"

"اے واہ!"، منجلی دلہن کو ایسے بے موقع ہنسی آئی کہ خالہ بی کی تیوری چڑھ گئی، مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں :-

"ہمارے دیور جی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے - یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔"

مومانی جان غصے میں بولیں : "لو اور سُنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کرتے ہیں؟ ہزاروں غیر مردوں کی نگاہ نام پر پڑے تو کیا شرافت رہ گئی! "

منجلی دلہن تیکھے پن سے بولیں :- بھلا نہ سہی دلہن کا نام، دلہے کا نام تو لکھوا سکتے تھے نا!

اوپر سے چھوٹے میاں کوٹ پتلون ڈالے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری پنچایت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے - سارا معاملہ سمجھ میں آگیا - ڈھٹائی سے بولے : - ہاں ہاں بانو بہن کی نسبت ہمی نے لگائی ہے۔"

سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوئی۔ ساس مردے بول چال بھی شروع ہوگئی مگر

ادھر اتنے دن گزرنے پر بھی خالہ بی کے رویے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کلموہے کا گلا گھونٹ دیں۔ مگر پھر سوچتیں کہ کیسے دردوں سے پیٹ پھاڑ کر جنا تھا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں:۔

" کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے "

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو بھی کہے سُن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصے کے اظہار کا یہ طریقہ انھیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اُٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھا کرتیں۔ بہوؤں کی منڈلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی:۔

" میرے جیتے جی کون حرام زادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے "

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے باجتے تھے کہ شہزادی بدرکمال کو بیاہنا پڑا تھا یا اب یہ حال کہ اللہ جانے کس سڑی ماری کو گلے کا تعویز بنا رکھا تھا کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو یہی آس تھی کہ بات کچھ بھی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے نہ رانڈ رنڈی، بس چپ ہی پھرا بنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھرے گا تو آپ ہی آپ رستوں پر آجائے گا۔ اور ایک آدھ دن کسی بھاوج کا پلو پکڑ کر کہے گا:۔

" بھابی ماں اب ہماری بھی کروا دو نا "

بیٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہوتا ہی ہے کہ ہر آیا گیا پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے، " کیوں بیٹھی ہے؟ کیوں بیٹھی ہے۔؟ " مگر کھاتا کماتا جان جوان بیٹا بھی اگر یوں ہی ڈھکلیاں کھاتا دکھائی دے تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی مائیں بھی تو تھیں ہی۔ اپنی اپنی بیٹیوں کی سب ہی ماؤں کو فکر ہوتی ہے۔ تو وہ کیسے نہ ہیں؟ کبھی کبھار خالہ بی کا جی چاہتا اُکتا کر بول ہی دیں:۔

" شادی کے قابل ہی نہیں تو موا کیا کرے شادی "

اتنے پر بھی خالہ بی تہیہ کیے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی دی تو بس حضرت کو کس ہی دوں گی۔ مگر حضرت تو ایسے تڑپڑے تھے کہ پٹھے پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی اور رات اُٹھتی تو سارا آنگن مہندی کی کچی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کھلی، ادھ کھلی کلیوں اور پھولوں سے مہک مہک اُٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے اور کھیل کُود مچتا۔ چھوٹے میاں کہتے تو ہم بیس پچیس کے، مگر بھتیجیوں، بھتیجوں سے مل جل کر

بس بچے ہی رہ جاتے ۔ اس رات خالہ بی سفید چاندنی بچھے تخت پر چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں ۔ بہوئیں ادھر ادھر پلنگوں پر ہنسی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی تھیں ۔ بچے سارے میں شور مچا رہے تھے کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے ۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جا لیا ۔

"چچا میاں کہانی ، چچا میاں کہانی ۔"

"ارررے" وہ کوٹ کا دامن جھاڑتے ہوئے بولے ۔ "یہ کوئی وقت ہے کہانی سننے اور سنانے کا ؟ پھر کبھی سہی ۔"

"اے لو ! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا ؟" منجھلی بھابی تنک کر بولیں : "پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں ؟ چھ ہاتھ کے چچا ہو ، کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو ۔"

"اچھا ، اچھا" وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے ۔ "یوں خفا کیوں ہو رہی ہو آپ ؟ تو بھئی بچو ! ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک تھا وزیر زادہ ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیر زادے نے پالی ایک مینا ۔ بڑی خوبصورت سی کہ بس دیکھے ہی جاؤ ۔"

"میرے جیسی چچا میاں ؟" صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا ۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے ۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظریں دوڑانے لگے ، گویا دیکھتے ہوں مینا کس جیسی تھی ۔

"بڑی پیاری سی تھی بھئی وہ ۔ منی سی ۔ گڑیا سی ۔ بس جیسے اپنی کاکل ......"

جانے کون سی رو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے سٹ پٹا گئے ۔ اور ادھر پوری فضا میں بم گر جانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ۔ بھابیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سروتہ یوں ہی ٹنگا کا ٹنگا رہ گیا ۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کاکل نہ تھا ۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا ؟ بھئی نام ہوا کرتے ہیں رابعہ ، کلثوم ، صالحہ ، مریم ، شاکرہ ، زہرہ ، سلیمہ ، یہ کون تک ہے کاکل ۔؟

خالہ بی کو اپنا ماں ہونا یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک تناکے کے ساتھ اٹھیں اور عین چھوٹے میاں کے سر پر ، بیچ کر ان کے بال ہاتھوں میں کھسوٹ ڈالے ۔

"بول یہ کاکل کون ہے تیری ہوتی سوتی ؟"

چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ سا چھا گیا، بڑی مضبوط آواز میں بولے :۔
میں نے دو سال ہوئے شادی کر لی ہے اماں ۔ اور کل آپ کی پوتی ہے اور میری بیٹی۔"
چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا بہانہ تراشتے تو خالہ بی کے غصے کو راہ مل جاتی، مگر انھوں نے اتنا بڑا۔ بے باک سچ کہہ دیا کہ خالہ بی کے ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے۔
"شادی کر لی ؟" وہ مرے مرے لہجے میں بولیں، "مگر کس سے ؟"
"میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں ۔ بہت غریب لوگ ہیں اماں، بڑی اچھی لڑکی ہے ۔ آپ بھی ..... ؟
خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر بھڑک اٹھا :۔ "ہاں ہاں غریب ہے ۔ مگر بہت اچھی ہے سوچھنال کی ایک چھنال ہوگی ۔ ورنہ یوں بغیر گاجے باجے کے بچہ نہ جن لیتی ۔"
چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا ۔ سامنے ہی بھتیجے بھتیجیاں کھڑی تھیں ۔ آنسو ان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے ۔ بڑا دل کر کے بولے :۔
"قسم خدا کی اماں آپ نے مجھے جنا ہے اور آپ کا اس سے بھی بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں، جو چاہیں کہیں ۔"
گھر کی بہتی گاتی فضا میں ایک رکا رکا پن آ گیا ۔ بچے قصور کرتے ہیں تو ماں باپ معاف کر ہی دیتے ہیں مگر قصور بھی قصور جیسا ہو ! یہ نہیں کہ زندگی جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلرک زادی کا ! جس کے خاندان کا پتہ نہ بُرے بھلے کی خبر ۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا ۔ بھابیاں منہ دے کر بات نہ کرتیں، بھائی کھنچے کھنچے رہتے ۔ اتنے بڑے کنبے میں رہتے سہتے بھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے ۔
برسات کے دن لگے، بدلیاں چھاتیں، برس جاتیں، کبھی چھاتیں اور ہوا کے زور سے بکھر بھی جاتیں ۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں ۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا ۔ ناکیں سڑ سڑانے لگیں ٹھوں ٹھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا ۔
خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی، اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں ۔ کھانسی زکام سے لے کر ہیضے بخار اور پھوڑا پھنسی تک سبھی بیماریوں کی دوائیں ۔ بڑے تایا طب کرتے تھے اور ان سے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے ۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا ۔ موا گھڑوں پانی پلا دیتے ہیں، کیا فائدہ کرے گی ؟" کوئی مارے ترقی پسندی کے دواخانے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو موری میں سے بو اٹھتی دیکھ کر جان جاتے کہ خالہ بی نے بہا دی ہوگی ۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے، آنکھیں سرخ اور رجاگی جاگی سی، بال اُلجھے بکھرے۔ عجب ہونقوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے۔ کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے۔ دوپہر کا کھانا کھانے آئے پھر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجب بدلا بدلا سا ہوگیا۔

صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہوگئی۔ چنگی بڑیا تو جاری ہی تھی، لوا کریں نے ڈرا دیا۔ "اے بی کالی کھانسی ہے۔ بھلے کو شروع میں علاج کروالو ورنہ جو پڑ طبیب گر گئی تو۔ بٹیا عمر بھر کو گنگانی ہو جائیں گی۔"

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا، خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اُٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے ہی میں تھیں کہ ٹھٹکے آجاے میں دیکھتی ہیں کہ اُن کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آتا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو غور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے، چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی دل نے درد ضرور دکھایا ہوگا۔ اماں نے بھن بھنا کر فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلیجہ کر کو سا دیا۔

"جیسے گورے پر پیدا ہوئی ہے، ایسے مر بھی جائے۔ ہونہہ! — علاج ہو رہے ہیں لاڈلی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیک لگا دی کمبختوں نے۔"

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے۔ چڑھتے اُترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔

سرما کے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے ڈھیر سی سرخ سرخ گاجریں خریدیں، ان کے بن کش کئے، ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگچہ چڑھایا۔ گھر کی بھینسیں تھیں، کھویا خوب تھا۔ سیر دو سیر کھویا بھی اس میں انڈھا دیا۔ وہ مزے کا حلوہ بنا کہ چار گھر دور تک خوشبو اُڑ اُڑ گئی۔ دستر خوان بچھا، سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا، مگر وہ اپنے کام میں اُلجھے ہوئے تھے، بولے:-

"میرا کھانا یہیں پہنچا جا۔"

جب سے اُنھوں نے خالہ بی کی چھاتی پر سل رکھ دی تھی یہ ان کے بُرے بھلے میں نہ بولتی تھیں۔ جیسا کہتے تھے، کر دیتیں۔

"مرو کہ جیو، ہمیں کیا لینا ہے؟" اور ادھر چھوٹے میاں تھے کہ مچھلی کا کانٹا ہو کر رہ گئے تھے کہ مچھلی کا انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھانے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سرپوش اٹھایا بھی نہ تھا کہ الائچی اور گھی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اتر گئی۔ سرپوش اٹھا کر دیکھا:۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوہ، چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچہ اٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آکر اٹک گیا۔ ہاتھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ ادھر اُدھر دیکھا، باہر سب کھانے میں گمن تھے۔ برتنوں، چمچوں اور رکابیوں کی کھڑ دھڑ ہو رہی تھی۔ جلدی سے اُٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اُٹھا کر اس میں پیٹ لی۔ جیب سے دستی نکال کر پوٹلی سی بنالی اور الماری میں رکھ خود طشت کے پاس کھڑے کھڑے اُلٹے سیدھے نوالے ٹھونسنے لگے۔

خالہ بی عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لو نیچی کر کے گئی تھیں اور سارے میں ملگجا ملگجا سا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پر پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے ادھر دروازے میں سے جھانکا، سامنے دیوار پر اُن کے سر کا سایہ اُبھرا اور پھر اندر ہوگیا۔ خالہ بی کی بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اُٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اُٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈراوا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم تین چار ٹکڑوں میں ٹوٹ ٹوٹ گئی۔ انھوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا، خالہ بی کانپتی کھڑی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں:۔

"اے ہے! پیاروں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا۔ خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دلوائی تھی تو ایسے حرام خوروں کے لئے نہیں۔"

چھوٹے میاں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولنا چاہا مگر وہ پیر بختی اپنے بستر تک پہنچ چکی تھیں۔

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جیسے کسی نے چرالی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا پھولوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔

بڑے بھائی جان تھے، پھر اختر بھائی، اچھے بھیا، عزیز بھائی، ذاکر بھائی، پھر چھوٹے بھیا کہ گھر بھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے قہقہے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چونچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو۔ کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی۔ کسی کا بوٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ بھابیاں ایک سے ایک رنگا رنگی کپڑے پہنتیں۔ زیور سے سجی بنی، ہنستی بولتی گھومتی ہیں اور بھائی ہیں

کہ کھلے خزانے دھڑسے دروازے بند کرتے ہیں۔ دُلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کرواتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چوٹوں کی طرح راتیں سجاتے۔

کا کل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوجھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس میں کیا رکھا تھا؟ ٹریننگ وریننگ گئی سب چولہے بھاڑ میں، دل پر ایسا پتھر آ پڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے۔ کوئی بات ڈھنگ سے نہ کر پاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں۔ اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی لگا دی تو کیا چھوٹا ڈھیلا بھی ہاتھ پڑتا ہاں بس انگلی میں زمانے سونے کی نو ماشہ کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں، سو طے کر لیا ہے کہ رانی بٹیا کی سالگرہ اسی سے رچائیں گے۔

دل امیروں کا بھی ہوتا ہے اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں!

دکانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا ہار، سستی قیمت کا ریشم کا سلا سلایا فراک، ننھے منے سرخ جوتے اور چاکلیٹ کا ایک ڈبہ، بطور تحفہ کافوری گڑیا، سارا سامان الماری میں ڈرپ کر کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں تو رنگ برنگی دوکان سجی ہے۔ تمام گھروائے میں بوم ہو گئی کہ ہو بھئی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی رکھیلی کے لاڈلوں کو سجانے کے جتن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے منہ تک پہنچی۔ گھر تھا کیا موا اچھا خاصا چھلنی تھا کہ ادھر بات پڑی نہیں کہ ادھر ٹپک پڑی۔ خالہ بی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سلیقے سے خریدا گیا تھا سارا سامان۔ سے تنھا منا سا سرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کا چمچماتا ڈبہ۔ ایک پیٹھے کے ڈبے پر ایک چٹھی لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟" انھوں نے ڈپٹ کر نسیم میاں سے پوچھا۔

"جی.... جی دادی اماں ابھی پڑھتا ہوں" وہ اٹک اٹک کر سنانے لگے۔ "ننھی گڑیا کی سالگرہ پر —— ارمان بھری پہلی سالگرہ پر۔ اس کے باپ کی طرف سے"

خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جلتے گھی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایسے پڑ گئے۔

"لو اور سنو اچھوتی نہ چلے موے حرامی پلے۔ ہماری نقل میں سالگرہیں پڑتی ہیں۔" اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری، ایک ہاتھ سے فراک کھسوٹا۔ مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمیں پر رلنے لگے اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہو گئی۔ ڈبہ دور جا گرا اور اس میں سے بڑی سی کافوری گڑیا نکل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آنسو بزدلی کی نشانی ہیں اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے بھاؤ آیا۔ یوں دکھانے کو تو ہاتھ بھر لمبی ناک دکھا دیتے مگر گھر دار الگ ماندنے کی سہتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھور ٹھکان تھا نہ اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اک دم سے گھر چھوڑ کر چل ہی دیں۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی؟ خود پر ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ کر چلتا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کو بھی پتہ نہ لگتا۔ گڑیا کے ٹکڑے دیکھ کر رات بھر دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ "اب اس گھر میں نہ رہوں گا" انھوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کا کل بیٹا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے چپکو بیکو روئے جاتے تھے۔!

مردوں کا ادھر ادھر نگاہیں جھکانا عام کی بات ہے۔ اور کنواروں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی ہے۔ ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی تو گوٹھا جا لبایا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالو میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا ہے۔ نوٹنکی کے بہانے سال چھ مہینے دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھاتے ہی تھے اور دوسری ہی نوٹنکی دیکھ کر لوٹتے تھے۔ مگر ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے۔؟ دل آ جانا بھی بری بات نہیں۔ اللہ نے آنکھ دیکھنے کو دی ہے اور اگر چلتے پھرتے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں بھر گئی تو کیا ہوا؟ مگر یہ تو بری بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی ہی بنا ڈالیں!

بھلے سبھاؤ میں ایک دن منجھلی بہو نے ساس کو رائے دی بھی۔ یہی کہ چھوٹے بھیا کو معافی دیدیں مگر خالہ بی کا بھی وہ حال تھا کہ چولہا تو مدت ہوئی بجھ چکا تھا، مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ ذاکر میاں کی بیوی کا کہنا تھا کہ مرزور چھوٹے میاں کی بیوی اچھے گھر اور اچھے عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کھوٹ خرابی دیکھتے ہیں۔ بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور لگتا ہے دل کی بھی بری نہیں۔ انھوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں بڑے بھائی جان، اچھے بھیا اور عزیز بھائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے اون کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے موزے اور ویسی ہی ٹوپیاں لائے تھے۔ بھابیوں نے پوچھا بھی:۔

"کہاں سے لائے میاں؟ کیا قیمت ہے؟"

تو ذرا مسکرا کر بولے:۔ "میرے دوست کی دکان ہے۔ وہاں سے لے آیا ہوں" بھلا کون دوست ایسا جی والا تھا کہ گھر بیٹھے بھکٹ میں اپنا نقصان کرواتا؟ اور منجھلی بھابی نے جو نوٹ دیکھی

تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بُنائی ہے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے، ورنہ اور کس کا پھیپھڑا اُچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مر جاتی مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا اتہ پتہ نہ ذات پات کی خیر خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اُٹھایا کرتے؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے۔ ایسے نہیں کہ بس راہ چلتی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل بنالیا۔

اس دن تو خالہ بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچّے اودھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے کیسی چہل پہل تھی! ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔ اور تو سب تھے، بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر رک رک کر بولے:۔

"اجی میں کہتا ہوں بچّے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔"

خالہ بی سمجھیں ان کھیلتے بچوں میں سے کسی نے شرارت کی ہوگی، اس پر کہہ رہے ہوں گے۔ بولیں،

"ہاں اور بچے کرتے بھی کیا ہیں؟"

باپ خوش ہوگئے۔ سمجھے بات بن گئی۔ بولے:۔ "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ اب ہوا سو ہوا۔ جوان بچہ ہے، جان پر کھیل گیا تو کیا کرلیں گے؟ آنے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی؟"

خالہ بی نے تڑک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اے تو بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے، ہوتا ہوگا تمہارے بڑوں میں کہ چلیتیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں ایسا ہوا تھا نہ ہوگا۔ میں بھی سمجھی کیا کہتے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہتے ہو تو — سامنے قبلہ ہے، ہاں سچ کہتی ہوں باولی میں چھلانگ لگا دیتی۔ غضب خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیا ہے کہ دیدوں کے سامنے ایسی واہیات حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جائیں۔ سچ سناتی ہوں کہ کتّے کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤں پر اُس حرافہ کو اپنے در پر نہ پھٹکنے دوں کہ میری کوکھ کی بد دعا سمیٹ رہی ہے۔"

خالو میاں چُپ رہ گئے۔ حیل حجت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے۔ بر روایتی بادشاہوں کی طرح انھیں بھی ساتواں شہزادہ بے حد عزیز تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہو تو مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرتے پوری کر دیتے۔ ادھر

ماں بگڑتی ہی تھیں کہ جھوکرے کو دو کوڑی کا کر دو گے، مگر ان سے سہار کہاں ہوتی کہ چیز سامنے دھری رہے اور بیٹا بلکتا رہے۔

اب بھی ان سے کہاں سہار ہو رہی تھی! بیوی تھی کہ چار گھر پرے ہی تھی اور بیٹا تھا کہ خالی پہلو سوتا تھا اور مرد ہوتے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ زور دیا بھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی سدا کی ہیکڑی ہیں، بات غصے کی ہو یا مذاق کی، جو کہتیں پورا کر دکھاتیں۔

رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی، جیسے کہ سدا آتی تھی۔ گھر بھر میں وہی چہل پہل مچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پر پڑتال پڑ رہی ہے کہ نمازی عید گاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی جھڑا رہی تھیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمربند نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے بٹن نیچے اوپر اٹکا لیے تو کسی کا ازار بند ٹخنوں تک لٹک رہے اور اسے کھونسے تک کی بھی سدھ نہیں۔

اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموش بیٹھے۔ اُٹھے، چپ چاپ غسل کیا صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیئے۔ ماں بیٹے کا مدت سے ابولا بند ھا تھا۔ نہ یہ ان سے بات کرتی تھیں نہ وہ خود ہی رُخ دیتے تھے۔ عید کے دن تو بڑے دشمن بھی گلے مل لیتے ہیں، یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آ کر سلام کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے لگاتیں تو دُعا دینی ہی پڑتی۔

"خدا بڑی عمر کرے سہرے کے پھول کھلیں۔"

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے اور کس کے نام سے؟ غصہ کی ایک لہر اُٹھی اور ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چور نگاہوں سے بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصے میں دھان پھوں، دھاں پھوں کر رہی تھیں۔ چپکے سے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عید گاہ سے واپس آ چکے تھے سات بیٹوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، ڈھیر سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کہ سلام دُعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔ مردوں کی عید گاہ سے واپسی پر عورتوں کی عید مچتی ہے۔ زنانے میں دھوم مچ گئی ساس پیڑھی پر بیٹھ نگاہ و دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں

بڑی دلہن نکلیں: ہری بنارسی ساڑی، جھکا جھول زیور، سنگھار پٹار کیے، مسکراتی ہنستی، کن انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں، ادھر سے منجھلی دلہن آئیں: کھڑا کمخواب کا پاجامہ، بنارسی چولی

کرتی، تانس کا دوپٹہ، گہنے پاتے سے سجی بنی ۔ عزیز میاں، ذاکر میاں، اکرم میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چھیڑ کرتیں، ہنستی مسکراتی ہوئی آئیں۔ پھر بلقیس آئیں: چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ پیاری تھیں ۔ سرخ کامدار تولواں ساڑی پہنے ۔ چھ مہینے کا پیٹ اونچا اونچا اُبھرا ہوا اُسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں ۔ ایسے بھاری زیور کپڑے اور پہننے والی ایسی نازک پھول پان! چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بچے رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پان ٹھونسے تھوکتے پھر رہے تھے۔ کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں کہ ابھی وہاں ۔ مردانے میں ملنے والے آئے اور یادل نخواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں بھی عید ملنے، مصافحہ کرنے گئے ۔

اک دم اندر سے بچوں کا شور اُٹھا اور ہاتھوں میں ایک بنڈل سا پکڑے لے کے آئے ۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سُرخ ریشم کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا بھاری کو سی کی ہوئی تو ایک ہی دھوپ میں بکس بکس جائے، اور ایک سُرخ ہی رنگ کا بھاری سا فراک، جس پر مگر مگر ستارے ٹنکے ہوئے تھے، چھوٹے چھوٹے ۔ یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آنسو بھر اتحفہ تھا۔ صبح یوں ہی خالہ بی ساروں کے کمروں میں اگربتیاں سلگاتی پھر رہی تھیں کہ اُنھیں سرخ پلو جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا تو اُنھوں نے کہاں سوچا تھا کہ یہ عید کی سجاوٹ بناوٹ ہے۔ وہ بڑے غور سے ساڑی کو دیکھنے لگیں ۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دُلہن گزر گئیں ۔ جن کی بنارسی ساڑی چم چم چمک رہی تھی ۔ سو دو سو سے کم کی کیا ہوگی ؛ پھر منجلی دلہن کی کہ کمخواب کا پاجامہ ہی سوڈیڑھ سو کا ہوگا، کرتی، چولی، دوپٹہ تو الگ رہا ۔ پھر چھوٹی بہوئیں، جن کے کپڑے ایسے بھاری، کامدار، تولواں کہ چلتے میں لپک لپک جاتی تھیں ۔ اور یہ ساتویں شہزادی کیا بن رہی ہے آج؟ — خالہ بی کا جی اندر سے پگھل اُٹھا ۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور بنڈل کرسی پر پٹخ، اُلٹے پیروں واپس نکل گئیں ۔

چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑھے بارہ ہو رہے تھے ۔ کرسی پر سے بنڈل اُٹھایا، ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ خالہ بی لپکی ہوئی آگئیں —

ہاتھوں میں بڑا سا طشت سنبھالے، جس پہ جھالریں لگا ہوا سُرخ کپڑا لٹک رہا تھا ۔

طشت میز پر ٹکا کر اُنھوں نے چھوٹے میاں کا کندھا جا پکڑا لیا ۔ ان کی آنکھیں یوں گیلی گیلی تھیں کہ ماں کا جی کٹ گیا ۔

"کہاں جا رہا ہے؟" اُنھوں نے تن تنا کر پوچھا ۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا، سر جھکا لیا ۔

خالہ بی نے بنڈل ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تلخی سے بولیں: "اور یہ کیا ہے؟"

"چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں: "عید کا جوڑا ہے نا۔؟"

چھوٹے میاں پھر بھی سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔

"کلموہے عید پر کوئی ایسا ہلکا سا جوڑا بنایا کرتا ہے۔؟"

چھوٹے میاں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جو غصے غصے بول رہی تھیں۔

"مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے گز والا ریشم! شرم تو نہیں آئی تجھے اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے؟"

چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔

"یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو پہنا کر لے آ۔ اکیلے میں اُس کا جی گھبراتا ہوگا۔ یہاں چار میں جی بہلے گا۔" اُنھوں نے سرخ بنڈل کی طرف نفرت سے دیکھا۔

"تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن یا ٹکڑی ہی خرید لیا ہوتا کہ ساڑی سا جری تو ہو جاتی۔" اور اُنھوں نے طشت پر سے طشت پوش ہٹا دیا۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ یہ وہ پانچ کامدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خود اپنے ہاتھوں تیار کئے تھے!!!

فاختہ

مینا ابھی ابھی بستر پر سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جلس رہا تھا سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی، اُس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

بشیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اک دم انھیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اُسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا، جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے اُنھوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک اتر گئی، اک دم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ اُنھوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا :۔

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی بھاگتی ہوئی آئی اور آنکھوں پر سے بال ہٹاتی ہوئی بولی :۔

"ہمیں بلایا ابا میاں؟"

"بیٹی تم میرے بستر پر سوئی تھیں!" اُنھوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا۔" اور اُنھوں نے ارشد کو پکارا۔ "واہ جی۔ ہم تو ایکساں منی

کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ ہم نے تھوڑے ہی دھرے میں گندے پیر آپ کے بستر پر۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"

شبیر میاں سن ہو گئے۔! بستر پر مچلتی ہوئی خوشبو نے انھیں آپ ہی بتا دیا تھا۔ میں مینا کے پاس سے آئی ہوں!"

انھیں یاد آیا، ممانی بی سدا مینا کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور مینا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلنے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر بڑی باریک سی ملائم سی میٹھی آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگادو میاں آگئے۔"

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی، لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھے رہے۔ "اے خانساماں کھانا لگادو۔ میاں آگئے"۔ ممانی بی مینا کو کسی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بٹیا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگایا کرتے ہیں"، مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا، مینا کی زبان ہکلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے نگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی، ممانی بی کہتے کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو، کوئی کاج، ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی چیز پکی رکابیوں میں لگا، سرپوش ڈھک جھٹ سے نصیبن بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے تو ان کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی جی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا، وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے، شریف خاندانی بوی تھی، دو بچے۔ مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رفیعہ بیگم بھی گھڑی دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے؟ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولھویں سترھویں میں ہی تھی، پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انھی کی کوششوں سے ہی نہ، ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی

کہتی ہیں :۔

" واہی ۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے، گن کا، ڈھنگ کا، اب اور کیا دیکھیں گے ؟ " مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں ۔ ممانی بی نے کہا بھی :۔

" تم ایسی جنم جنم کی دشمن کاہے سے ہو گئی ہو، لڑکی کی کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو "

ہنس کے بولیں ۔" اے ممانی بی ! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کریں ہمیں "

اصل میں مینا کی مرضی نہ تھی ۔ کیوں نہیں تھی ؟ بس نہیں تھی ؟ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سُنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں ۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف "نہیں" سُن سکیں، اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی ۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں ۔ سوچا :۔ اپنی طرف سے تو یہ زور زبردستی سے کہہ نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی بھگت "۔ خاموش رہ گئیں ۔

ویسے سچ بات تو یہ بھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں ۔ انھوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرا دی تھیں ۔ " عصمت " تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا ۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی ۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سُنا اور مینا نے چندہ بھیجا ۔ اتنا یقین تو انھیں بیٹی پر ضرور تھا اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر مینا نے نہیں پڑھیں ۔ مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی گرلے کے ایک مضمون ضرور لکھ ڈالا ۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے ؟ وہ چھپ بھی گیا ۔ سارے خانوادے میں وہ لے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی تو نہ بن سکا ۔ پانی ایک ہی بار زور توڑ کے راہ بنالے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے ۔ پہلی بات تھی، سبھوں میں دھوم سی ہو گئی مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ مینا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی ۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے تھے، اُلٹے سیدھے ناول، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں ۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی " دولت پر قربانیاں " تھی ۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی ۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے، سرے سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی ۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا ۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا ۔ چار کلی کے کھڑے پائنچوں کے پاجاموں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی ۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنیں ہی نہیں ۔ جگمگ جگمگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی، جھکا جھول چندن ہار اور چوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا نکلس ڈال لیتی ۔ اور یہ بھی روز روز نہیں ۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا، نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھ، بھونڈا گلا، آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی :۔

"اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھونٹھے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی"۔ یہ مسکرا کر رہ جاتی۔ خاندان والے تو علی الاعلان کہتے کہ "اے بی بڑی بیگم نے تو لونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے"۔

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو پچ پچ کرنے لگتی ہیں اور پھر اسی چھکا چھک اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں۔ ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے اُتم ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب یہاں سسرال میں بھی اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔ مینا کو بھی حسب قاعدہ سب سے پردہ کرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اُچھالے تو سبھی جڑیں کاٹ پھینکیں۔

رفعیہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں، ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کدھر گزر ہوتا، محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی۔ کچھ سمجھ پڑا، کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے کچی زچہ کو ایسے جھنجھوٹے دیے کہ اُلٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ ممانی بی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ مینا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ بٹیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ چھنو خالہ کا بٹیا حوض میں گر پڑا تھا تو انھوں نے اوندھا لٹا کر سارا پانی نکلوایا تھا۔ مہتو مالی کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی پتیاں بار بار چبواتی رہیں۔ ممکن ہے رفعیہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے۔ اے مان لیا کہ ڈاکٹرنی نہیں بنیں، پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو دینی آتی ہی تھی۔

دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا:—

"چھوٹی بی بی سے کہیو بہو کی طبیعت اچھی نہیں"۔ ساری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اُٹھی! "اے میاں تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھوکری......"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی مینا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی:

"میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجیے"۔ اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں اُلٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا:—

"میں تو یہ بھول ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی !" ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے، "اور نرس کا کیا ہے ! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا، اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں ؟ پھر میں کیا کروں گا ؟"

اور اُن کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بیوی ان کا کہنا ذرا کم مانتیں اور بات بات پیچھے منہ کو منہ دیے چلی جائیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی منہ چار سے اُٹھاتا ہے اور یہی منہ چار میں بٹھاتا ہے، مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ "جاؤ بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔"

میاں بیوی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا: "کھیل ختم پیسہ ہضم۔" ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ بغیر دھویں کے لکڑی جلے۔

مینا کو بھی خیال آگیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہوگا؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی:۔

"چلیے دونوں مل کر اُسے بُلائیں۔" اور اسی چھپا کے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چلّہ بھی نہا لیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے ؟ لیکن مینا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ ممانی بی نے البتہ دو چار دن بیٹیا سے بول چال ضرور بند کر رکھی۔ مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک ؟ اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اُٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹیں بھی:۔

"پڑھ لکھ کر بالکل چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا۔" مینا ہنس پڑتی

رفعیہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا، ہوا۔ دوسرا اپنے وقت کا فیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفعیہ بیگم امید سے رہیں۔ اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

حیلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا مگر کرتی بھی کیا بیچاری ؟ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں، ہمارے یہاں اُٹھ آؤ نا۔" مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے، سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو اس پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے، دونوں بچّے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے، مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دُھلا دیتی، ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھالیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔ ممانی بی نے ہیر پھیر سے ذکر چھیڑا :۔ "اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یوں ہی رہو گے؟ ماشاء اللہ خود بھی جان جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی بھی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا۔"

شبیر میاں بولے :۔ " ممانی بی رنج وغم کی بات تو جانے دیجئے، میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں سا برتاؤ نہیں کر سکے گی، اور میں یہ سب برداشت نہیں کر سکوں گا۔" اُن کی آواز بھیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر کر بولے :۔ کیا گھر کا گھروا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اُڑتی ہے ہر طرف۔ باہر سے آؤں تو کوئی منہ دُھلانے والا نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو خود اُٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں، پیاس ہی بجھا دے۔ بچّے الگ تباہ حال۔"

مینا کا دل اندر سے پگھل اُٹھا، بولی :۔

"آپ ہمارے یہاں آجائیے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں، مگر......"، شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔ ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش سی رہ گئیں۔ مینا پھر بولی : "خاندان والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھئے۔ کتوں کا کام بھونکنا ہے، بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی، پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اسی دن اُٹھ آئے۔ مینا کا وقت اب بڑا اچھا کٹ رہا تھا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی۔ بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے۔ کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے :۔

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور، مگر یوں، جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چیٹ نہ پٹ۔ کبھی اونچی آواز سے بولتے، نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انھیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔

ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں :۔ "بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی، بس میں

نے ہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے:

"واقعی اچھا نام دیا آپ نے۔ مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جو اتنا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجے میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا لے تازہ تازہ دودھ ابالنے کے لئے چولہے پر چڑھایا تو آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر مولیٰ کی دہائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی اماں چٹ پٹ ہو گئیں۔ اور مینا! مینا سے اللہ بن گئی۔ اندھیاروں میں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پہ اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی۔ جیسوں ہی تو پیام اچھے برے آئیں ہوں گے، مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی ہی میں لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی سیدھی، جھوٹی سچی، ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا، ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں، وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے!

بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے یہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا، اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ سی ابھرتی، اور پھر نرم نرم سی میٹھی آواز:-

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ تھی، نہ انھوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔

ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور منمنا کر بولا: "ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"

"ارے رے۔" مینا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا۔ "تو بھئی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل؟"

مینا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دے کر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتا بڑا کاجل جم گیا۔ مینا نے ڈبیہ میں کاجل بکڑا اور منے کو گود میں بٹھا کر اُس کی آنکھوں میں سلائی پھیرنی چاہی۔

"آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں وہ ہا نہیں پھیرنا چاہئے" مینا ہنس پڑی۔

"اچھا تو انگلی سے لگا دیں!"

"ہاں" ارشد نے سر ہلایا۔

مینا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ تھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اُس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگایا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجے میں آواز آئی:

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے"

دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد مینا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابا میاں آپا نے آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے"

"ہاں۔ ہاں بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پر بیٹھے تھے کہ مینا آگئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی:۔

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اُٹھا لیا" شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اُس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے، مگر اک دم رک کر سادگی سے بولے:۔

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ مینا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں" اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو، موسم کی تعریف کی ہو۔

"واہ بھئی۔ کیا اچھا موسم ہے!"

مینا بوکھلا کر اُلٹے پاؤں بھاگی، اُس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اُسے اُٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آگئی۔

سادگی سے بولے:۔

ذرا سنبھل کر سنیں چلیں، ابھی ہڈی چورا ہو گئی ہوتی!" اور اُٹھاتے میں مینا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور، لیکن کوئی اگر پوچھتا:۔ "سناؤ میاں آج کی خاص خبر کیا ہے؟" تو وہ سٹ پٹا کے رہ جاتے۔

مینا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سُنائی نہ دی تھی۔ اُنھوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں، مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم نرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آئے

"اونہہ! زکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے تو مینا نے اُنھیں مشورہ دیا تھا:۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو ہونا چاہیے!"

اب اُنھیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیے نا۔"

پھر اُنھیں مینا اور ممانی بی کے احسان یاد آگئے۔ اُنھوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق بَر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا جو اتنی پیاری، اتنی خوبصورت، اتنی سگھڑ، اتنی تعلیم یافتہ ہے، اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی بچّے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے، بسورتے نہ تھے اور صورت پہ بہار آگئی تھی۔

"لاحول ولا" شبیر میاں نے سوچا، میں بھی کتنا کورا اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔ اخبار مونڈھے پر رکھ کر اُٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے مارے سُوئیٹر چڑھا لیا تھا۔ اب تو گرمی ہوئی تو اُسے اُتار پھینکنا چاہا۔ سُوئیٹر کھلے گلے کا نہ تھا، گردن میں سے اُتارنا چڑھانا پڑتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے زور لگا کر سوئیٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روایتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سُنہری لٹ دیکھ کر اندھا دُھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر میاں ایک جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اُٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر پھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار ہی تھا۔ تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دیئے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی، مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھاوے کو دولہا سے شرمائے اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے بھی انھیں یہ خوشبو اپنے تکیے پہ، بستر پہ مل چکی تھی، جو اپنے منہ سے کہتی تھی :۔

" میں مینا کے پاس سے آئی ہوں "

اب مینا اتنی ننھی گزری نہ تھی کہ کسی کے بستر پہ لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جاتے تو اُسے بھی گھسیٹ لیتے۔

" آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ بھی ہمارے ساتھ چلئے "

تب تک وہ سوئیں سوئیں، یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی۔ کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پر لڑھک جاتی۔ انھیں کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا، دُھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم، ملائم گھلی گھلی سی آواز :۔

" اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے "

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے :۔

" مینا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا، کیڑا نہ لگ جائے "

اس دن تو مینا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھری پر تھے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آ جھکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی مینا بیٹھ گئی۔ سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک، بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال اُنھوں نے اپنی ماں کے متعلق نہ کیا۔

مینا خود ہی بول اُٹھی :۔

"امی کی یاد آتی ہے مُنّے ؟ " ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے :۔

" اوں ہوں۔ آپ جو اچھی ہیں ! "

" مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں " وہ ہنس کر بولی۔ " اوں ر" ارشد بولا،

" ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں ! " مینا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اُٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مُسکرا کر بولی :۔ " سچ ؟ "

" ہاں اور کیا ! " ارشد بولا

مینا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اُٹھا کر

مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی۔ مٹھی کھولی اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنیئے —" وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور اک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ پلکیں لرز رہی تھیں اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی: —

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسی نہیں ہے!" اور وہ منہ پلو میں چھپا کر بنا کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

"شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دہری پوڑی سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ہوئی اور نرم ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی: —

"اے خانساماں کھانا لگا دے۔ "وہ" آ گئے ہیں!"

⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘ ⁘

سہاگن

سلیمان میاں تو سدا کے بگڑدل تھے۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصور بھی نہ تھا جتنا کہ ماں باپ کا۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں۔

اکلوتی اولاد تھے، جو بولتے ماں پورا کر دکھاتیں۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سمائے گی۔ ماں باپ نے چھوٹ ہی ایسی دے رکھی تھی ——

بھری برسات کے دن، نالے میں پانی اچھل اچھل کر کتھئی رنگ کا ہو گیا۔ بھرائے دار ہوا اور جبرانے کا بہاؤ۔ ایسے میں بھلا کوئی لدل تیرنے کو جایا کرتا ہے۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی "کہاں جاتے ہو سلّو میاں —؟"

بولے: "ایسے ہی ذرا گھوم کر آتا ہوں اماں۔"

"دوئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں —؟ سارے میں چپچپاہٹ ہو رہی ہے۔ ایسے میں گھر میں بیٹھتے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں —؟"

اب تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں بھلا اس — موسم میں کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں —؟" دھڑاک سے دروازہ کھول باہر نکل گئے۔

صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور پھر کالی گھور اندھیری رات۔
رات کے سناٹے میں محلے والے سلو میاں کی لاش حفیظ میاں کے گھر پہنچا گئے۔ "ہائے میرا لال!" حفیظ میاں دہاڑے۔ اندھیرے کو ٹٹولتی ہوئی ماں دروازے تک آئی تو دیکھا کھری چارپائی پر ڈھلی ڈھلائی لاش رکھی ہے۔ اور کچھ ان سے دیکھا نہ جا سکا، دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑیں۔

اختر بھائی کے بچے کو گود میں لئے دودھ روٹی کا چورا کھلا رہی تھیں۔ "راجہ کیا کھائے گا۔؟"

"ہپا۔" منا منہ پھاڑ کر بولا

"راجہ کیا پیئے گا۔؟"

"مما۔"

"اور راجہ دولہا کیسے بنے گا بھئی۔؟"

"ڈھم۔ ڈھم۔ ڈھما۔" منا دونوں ہاتھوں سے ہو ہو کے تالیاں پیٹنے لگا اور اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

اک دم باہر سے عزیز میاں لپکے ہوئے آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں مسلا مسلایا پوسٹ کارڈ تھا اور چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ اختر کو یوں بے تحاشا ہنستا دیکھ کر اُن کا منہ کھنچ گیا۔ اپنی ساری طاقت سمٹ کر وہ بڑی مشکل سے پکارے:

"اجی کہاں ہو؟ سنتی ہو!"

وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی اماں کو آوازیں دینے لگے

"جی۔" عارفہ بیگم کھلا سر ڈھانپتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئیں۔

"ذرا انڈے تلوا رہی تھی، ماما تو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔ توبہ میری آپ بھی یوں چلّانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے موا۔" اک دم ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں:

"کس کا کارڈ آیا ہے۔؟"

عزیز میاں کہیں بہت دور سے بولے۔ "سلیمان میاں کہیں تیرنے گئے تھے۔" اختر کے کان کھڑے ہو گئے۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا ذرا کھل گیا۔ میاں رُک گئے تو بیتابی سے بولیں،

"ہاں ہاں تو کیا ہوا پھر۔؟"

"آدھی رات کو ان کی لاش گھر لائی گئی۔

"لاش۔؟" عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "لاش۔؟" سفید آنچل اُن کے سر پہ پھڑ پھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں سے دودھ روٹی کا نوالہ چھوٹ کر رکابی میں جا گرا۔
ایک دم عارفہ بیگم دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بین کرنے لگیں:۔
"ہائے میری بیٹی! ہائے میری دلاری! ابھی تیرے سہرے کے پھول کھلے بھی نہ تھے کہ بیوہ ہو گئی ہائے!"
ماں کے آنسوؤں سے اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔
چند لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہو گئیں تھیں!
سلّو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نصیبوں کو روگ لگا گئے۔
اختر گیارہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا سلّو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی گڑبڑ مچ رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان کی گڑیا، یوں تو گیارہ برس پورے ہونے کو آئے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ ساس کی یہی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی بہو گھر میں چھم چھماتی چلے، ادھر ماں کہتی تھیں:۔ "کچھ نہیں تو بیٹا کو ہرا دوپٹہ تو اُڑھا دوں۔"
اب لاکھ ننھی تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھتی ہی تھیں کہ اپنی نسبت لگ چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے سلّو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عید، بقرعید ملنے آتے تو اماں پھٹکارتیں:۔
"دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں۔؟ اندر جا کر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی؟"
اندر جا کر بیٹھ تو جاتیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ "کالی ٹوپی، نامی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مر جاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پہ کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے وہ کیوں اِدھر اُدھر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا شرم! ابھی اماں اتنے چاؤ سے سویاں کھلا رہی ہیں تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟"
"اور تو سب گھر میں خیریت ہے خالہ بی۔؟" وہ بڑی شرما شرمی سے پوچھ ہی لیتے۔
خالہ بی کے چہرے پہ ہنسی کی لہر سی آتی مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔ "ہاں اللہ کا فضل ہے۔"
"اے لو، کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب بھابی دلہن سامنے بیٹھی ہیں، منا وہیں اچھل بھاندر رہا ہے، بھیا ساتھ بیٹھے سینوں میں حصّہ لگا رہے ہیں، ابّا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں۔ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں۔؟ بھئی یہ، واہ ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی!"
بھابی دلہن جان بوجھ کر اندر آ جاتیں اور نند ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔
"اے بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو بی؟"

"ہائے بھابی دُلہن قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو، مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈ سے سیویاں بھرے جا رہی ہیں، پھر میں......"

"کیوں ری بدذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ یہ غیب حال کیسے معلوم ہو گیا؟"

"اب بھابی دلہن کو کون بتائے! بھلا منگیتر کو دیکھے بنا کیسے رہا جا سکتا ہے۔؟ ہائے اتنی دور سے تو بیچارے عید کو آئیں اور کوئی انہیں دیکھے بھی نا! ایسا کیا بھابی نے کبھی بھیّا کو نہ دیکھا ہوگا۔" وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگتی کہ چوڑیاں کھنکھنا اٹھیں اور وہ سمجھ لیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ "ہاں جی تمہیں دیکھ لیا ہے"

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحد میں داخل ہونے کو ابھی تھوڑے بہت دن باقی تھے۔ مگر اکو ماں یہ تو جانتی تھی کہ سلیمان میاں کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جان جوان موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اُسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنے دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے۔ آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ اماں ایسے بلک بلک کر رو رہی تھیں۔

"ہائے میری اکو کا کیا بنے گا؟ ہائے میری لاڈلی!"

اماں کو یوں روتے دیکھ کر اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی اُبل پڑی۔

(۲)

اُس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دور گرا دیا۔

"اتنی سی رضائی لے کے میرے پلے باندھ دی۔ سر ڈھانکوں تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔" وہ بستر پر سے انگڑائی لیتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عازبہ بیگم نے سہم کر سر اُٹھایا۔

جوانی یوں چپکے سے کیسے گھر گھس گئی؟ ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتے آتی ہے پہلے آنکھوں کی پلکیں گہری اور لمبی ہو جاتی ہیں، پھر آنکھیں آپ ہی آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔ بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سُونے سُونے بھی رہیں تو لگتا ہے چلتے میں پائلیں سی چھنک رہی ہیں۔

یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جو یوں خاموشی سے گھر میں گھس گئی۔ پلکوں کی وہ جھالر جھپی جھپی کیوں تھی۔؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے؟ اور تو اور چلتے میں کبھی پائل نہ چھنکی اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہو گیا۔ راتوں رات اس باغ پر بہار کیسے آ گئی کہ کالی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ دبیز سے دبیز ہو گیا۔ آنکھیں جھلمل جھلمل قندیلیں سی بن گئیں، رہ رہ کر جگمگاتی اور کانپتی سی قندیلیں، بازوؤں میں رس بھر گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ کب ہوا۔؟ اور

جب اکو ماں بسترسے اُٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھما چھم کیسی۔؟ مگر اب بہار کو قید کیسے کیا جا سکتا ہے۔ سرسراتی ہوائیں تو آپ بتا دیتی ہیں ۔" لو بھئی بہار آگئی۔ بہار آگئی بہار آگئی۔"

عارفہ بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہار کی منتظر تھیں بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہار آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا۔

عزیز میاں کے لئے حقہ گرم کرکے بیٹھک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چاپ تھیں۔

"کیا بات ہے۔؟" عزیز میاں حقہ گڑگڑا کر بولے۔

اُنھوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا بے بسی سے بولیں:۔

"اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی ہے۔"

اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں، بہار جھومے تو چہرے پر ہنسی آتی ہی ہے۔ خوش ہو کر بولے:۔

"اچھا۔"

عارفہ بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔" آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی ؟"

عزیز میاں نے حقہ گڑگڑایا۔

" اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی تک نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے، اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہوگئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے نادان میاں کو دیکھا۔

" مزدور اپنا بوجھ زمین پر اتار کر خوش ہوتا ہے، سر پر دھرا رہے تو اس کی جان کھوکھلی پڑ جاتی ہے۔"

عزیز میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے:۔

" وہ تو ٹھیک کہا تم نے، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"خواہ مخواہ کی فکر۔؟" وہ درد سے مسکرائیں۔ یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے۔ میری تو ابھی سے جان آدھی ہوئی جا رہی ہے۔

ارے دنیا کی بیٹیاں جوان ہوا کرتی ہیں، مگر کہیں مائیں یوں پریشان ہوا کرتی ہیں۔؟ ہم نے تو ایسے موقعوں پر ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے ہنگامے ہوتے ہیں۔ اور بات ہے بھی ٹھیک، مالی پھول کے کھلنے پر اِتراتا

نہیں ہوتا، وہ تو پھولوں نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی ۔"
"مگر ہمارا ببول ....." وہ آگے کچھ نہ بول پائیں۔
"ہائے! آپ اتنی بڑی بات بھول رہے ہیں۔ بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی۔؟"
عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہوگئے۔
"کمال کی بات ہے ! ارے ہماری اکو ماں اتنی حسین، اتنی پیاری ہے کہ اس کے لئے ستر پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے، بلکہ تمہیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہو گی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔"
عارفہ بیگم نے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ لیا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا۔"
"کاش ایسا ہی ہوتا۔؟" میاں چونک کر بولے:۔ اس میں یوں روہانسا اور آزردہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی۔؟ ہوگا اور ایسا ہی ہوگا۔
"مگر آپ اتنی بات بھول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگیتر سال بھر پہلے ہی جان جوان مر چکا ہے۔"
عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔
"ہم چاروں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو جاتا مگر قسمت کو کیا کر سکتے ہیں۔؟ ایسے جوڑ کو جوڑ تھا، چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر عارفہ بی بی خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے، سوائے افسوس کے!۔"
دونوں خاموش ہوگئے، صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ باقی رہ گئی، عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا:۔ "کل دلہن بیگم کہہ رہی تھیں، حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔
"پھر۔؟" عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔
"ان کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو ......"
عزیز میاں نے مارے خوشی کے حقہ کی نے چھوڑ دی۔ "دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اجی دیکھا اس کے لئے ایک چھوڑ سو آئیں گے۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرتا کیا ہے۔؟"
"شاید ریلوے میں ملازم ہے۔"
"بھلا تنخواہ کیا ہے اس کی۔؟"
"ساڑھے تین سو۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں بولیں۔

اُنھوں نے خوشی خوشی پھر حقہ کی نے پکڑلی۔ "تب تو کچھ ٹھیک ہے۔ آج کل کے زمانے میں ساڑھے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے۔ اور پھر وہ بی۔ اے پاس بھی ہے نا۔"

بیگم کچھ نہیں بولیں تو پھر بولے :۔

"اور ماشاءاللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔"

وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجے میں بولیں :۔

"تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو بنالیں جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھالیا ہو ۔۔"

"منحوس ۔" عزیز میاں چلائے۔ نے پھر ہاتھ سے چھوٹ گری۔ اُنھوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔ "جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھالیا ہو۔"

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں :۔

"بس اپنے دنوں سے مجھے تو یہی ڈبکا لگا ہوا ہے، ورنہ کون بیٹی ایسی ہوگی جسے پیام نہ آتے ہوں، بُرے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پتھر تو مارے ہی جاتے ہیں۔ مگر ...."

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، غم نے جیسے ان کے چہروں کی تازگی چھین لی ہو۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آرہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ ابھی مہینہ بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ اکو میاں کے لئے نسبت والے آگئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا۔ پچیس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی یہی کوئی دو ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ یعنی باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی بُرا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزریں گے۔ دو چار بچے ہوں لیں گے تو عمر کا فرق مٹ جائے گا۔ جسم بھاری ہو جائے گا تو خود اکو میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دے گی۔ تنخواہ کا کیا ہے۔؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی چھان بین کر کے بھی دو مگر کھانے والی کے نصیب میں نہ ہو تو ہرا بھی سوکھا ہو جائے۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔"

اور خاندان کا کیا پوچھنا پاچھنا تھا؟ مسلمان تھے اور شریف تھے، یہی بس تھا! منگنی کے وقت انگوٹھی پہنانے جب اُنھوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو، گو کہ یہ عین ناممکن سی بات تھی (بھلا شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دیکھی بھالی جاتی ہے) پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دُلہن کی شکل بتا ہی دیں، ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی :۔

"بھئی کیا شادی کرتے؟ لڑکی کی ایک جھلک تو نہ بتائی۔ اب ہم کیا جانیں کیا بھید تھا جو بھی چھپائی گئی، اے کیا ہم مردے تھے کہ بیٹا کو کونے میں لے جا کے بٹھا دیا؟۔"

بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اُسی کے منہ سے " ہا " نکل گئی۔ کسی منہ پھٹ نے تو منہ پھوڑ کے پوچھ بھی لیا :-

" اے اتنی چاندسی صورت پر اتنی عمر ہوگئی ۔؟ "

عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا :-

" دوئی بہن چاندسی صورت کا کیا ہے ۔! بیٹی سیانی ہوتی تبھی وداع کرتے نہ کرے کے یوں ہی کچی ہنڈیا دسترخوان پر برت دیتے ہیں اور اتنی کم عمری میں ان کے باوا کی مرضی بھی نہیں " سمدھیانے میں لوگ یوں ہاتھ لمبے کر کر کے لڑنے بھڑنے کو تو جاتے نہیں ہیں، چپ رہ گئے مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر دھکیلے لگ گئے ۔

" نکاح خوانی کے چار بول جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی ہٹر کے گا ۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے ۔ "

" کیوں کیا ہوا ۔؟ " میاں ہڑبڑا کر بولے ۔

" ہوتا کیا ؟ بیٹا کی صورت دیکھی تو وہیں سامنے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایسی چاند سی صورت والیاں تو پنگوڑے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہوگئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں ۔ "

عزیز میاں کھنجا کر بولے :-

" ہونہہ ! بکنے والے کو بکنے دو۔ شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائیں گے "

سمدھیانے والوں نے جب بنارسی سرخ دوپٹہ اُڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا، سنگار بٹار کے اختر کی صورت ایسی چاند ایسی چمکنے لگی کہ سسیا بی لوٹ پوٹ ہو گئیں اور جاتے جاتے بول گئیں :-

دوئی میں جلد ہی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی ۔ ایسے اجالے تو میرے گھر میں ہونے چاہیں نہ بہن ؟ " وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں ۔

" ہاں بہن ۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے، چاہے اسی وقت "

" نا بہن، اس وقت کہاں لے جا سکتی ہوں ! ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی، ورنہ میرا بس جو چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی ۔ "

کہاں تو بہو اتنی پیاری لگتی کہ بار بار بہو کو دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں ۔ اور جلد سے جلد اُٹھالے جانے کا جتن تھا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی ٹھور ٹھکان ہی نہیں ۔

ایک ایسی ہی ہلکی سی شام کو سمدھیانے کا آدمی ایک پرچی پکڑا گیا۔

بہن صاحبہ!

آداب عرض ہے۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تب ہی چونکے تھے کہ ضرور دال میں کالا ہے مگر آپ نے بات کی تہہ تک نہ جانے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں، اپنے منگیتر کو کھائے بیٹھی ہیں، ورنہ جانے ہمارے گھر کا کیا حشر ہوتا۔ بہن آخر آپ کے دل میں بھی 'دیا' محبت تو ہوگی ہی، پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے کی اولاد کا برا کیوں چاہتی ہیں؟ آپ کے رویہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے بے چاروں کا جنھوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور صورت حال سے مطلع کیا، ورنہ ہمارے گھر بھی اُلّو بول جاتا۔ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔

امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے کی انگوٹھی، جو پورے سات ماشے کی تھی، واپس کر دیں گی۔

آپ کی بہن، سلطانہ بیگم

پرچی ہوا کے زور سے آڑی اُڑی، دیواروں سے سر ٹکرایا۔ برآمدوں میں گھومتی پھری، دالانوں میں رکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار جھکڑ کے ساتھ اکو میاں کی گود میں جا پڑا۔

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!"

"ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے!!!"

ہواؤں نے زور باندھا اور چلائیں:۔

"صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

دالان، پیش دالان، برآمدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے:۔

"ہاں ہاں صاحبزادی منحوس ماری ہیں!"

بی بی نے گھبرا کر میاں کی صورت دیکھی:۔

"میں نہ کہتی تھی کہ اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے!"

میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا؟

"جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہوگا جو یوں راندے جا رہے ہیں۔" عارفہ بیگم تھکی ہاری سانس لے کر بولیں۔

"سکھ دکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔"

عارفہ بیگم کے آنسو بہہ اٹھے۔

"نہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا۔ کھایا پیا انگ نہیں لگتا، راتوں کی نیند اُڑ گئی۔ دل کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری معصوم بچی!"

"برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ اوپر والے کے پاس انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو!"

(۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی چاپ سن کر اُٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"چائے لیجیئے۔ کلی کا پانی بھی رکھے جا رہی ہوں۔"

عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اُٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن مل کر دانت صاف کرتے، منہ ہاتھ دھوتے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ پارے دو پارے پڑھ کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ساتھ ادھر ہولے بھی جل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پا کر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آ جاتیں۔ نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سرہانے دھو کر چلی جاتیں۔

پانچ دس، منٹ کے بعد پھر آواز دیتیں:۔

"اے اُٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزہ آئے گا" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے

آج میٹھے بیٹھے اُنہوں نے آواز دی:۔

"ابھی اُٹھتے بھی" مگر میاں یوں ہی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے پڑے رہے۔

پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوڑ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اُٹھیں اور اُلجھ کر بولیں

"دوئی ایسی بھی کیا نیند کہ جوانوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ اس سے جلد تو ظہیر میاں اُٹھ جاتا ہے۔"

قریب آ کر زور سے شانہ ہلایا۔ پھر بھی نہ اُٹھے تو منہ پر سے رضائی کھینچی۔ بڑی مشکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔

"دوئی کم بخت چائے تو دیکھئے کہ . . . . ."

مگر الفاظ ان کے ہی رہ گئے۔ اک دم وہ چلانے لگیں:۔

"ارے دیکھو تو۔ سنو تو۔ یہ تو بولتے ہی نہیں!۔"

بیٹا، بیٹی اور بہو دوڑے ہوئے آئے۔ رضائی الگ کر کے دیکھا کہ ابّا میاں ہمیشہ کے لئے سو چکے ہیں۔

(۴)

جیسا کہ وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے۔ امیر گھر کی لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی ہوگی؟ شادی ہو کر سسرال کو آئیں۔ یہاں بھی اللہ کا فضل تھا، بڑی ساری زمینداری تھی۔ اگر روپوں کو کھوندلتی نہ چلتی تھیں تو یہ بھی نہ تھا کہ پیسے کو ترستی ہوں۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی۔

پھر سسرے مرے تو جائداد کا بٹوارہ ہوا۔ تین دیور، دو جیٹھ، ساس، نندیں، سب کے حصّے بخرے لگے، پھر بھی خوش تھے۔ یوں کہ اپنے آگے اپنی دال روٹی ــــ وہی بس تھی۔ اگر دل کو اطمینان و سکون میسّر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے، فاقے بھی بُرے نہیں لگتے۔ اور اطمینان و سکون کیوں نہ ملتا؟ میاں دل و جان سے واری۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی ایک بیٹا، ایک بیٹی، زندگی سکون سے گزرتی تھی۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی۔ جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے۔ یہیں بڑے زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ ڈھائی سو، دو سو اُن کے بھی آتے تھے۔ بیٹا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد بھول جاتے ہیں اور پھر کماؤ پوت بھی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نصیبوں میں کیا بدا ہے۔

بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے خلیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی تھی۔ بیٹے کی شادی جٹھانی کی بیٹی سے ہو چکی تھی، کسی بات کی، اگلی پچھلی کی فکر ہی نہ تھی، اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہوگی تو بہن اُٹھالے جائے گی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا اور دوسرے کی آمد آمد تھی۔

مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا تو کیا باندھنے سے پہلے ہی کفن لپیٹ بیٹھے۔

بھرے گھر میں دھول اُڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ اور سارے میں بوم ہو گئی کہ منحوس ماری ہے بُرے بھلے میں دل کو سہارنے والے میاں تو سنگی ساتھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو سہار نہ سکے پائے۔ اور چین سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی نہ اُٹھے۔

"اب کیا ہوگا؟۔" عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں اور کڑھتی جاتیں میاں

کا چالیسواں ہوتے ہوتے اس کڑھاپے نے انھیں بڑھاپے کی آخری سرحد پر لے جاکر بٹھادیا۔ آنکھیں سیاہ گڑھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بانسہ نکل آیا، ہاتھ پیر جھولا ہو گئے۔ دیکھ کر ترس آتا۔ اگر اکو ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ نہ ہوتی اور اک دم سے اتنی بوڑھی نہ ہو جاتیں مگر اب تو بھرے گھر میں کوئی چھایا ہوا تھا تو بس اکو ماں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں۔ جو بادل کی اوٹ میں رہے یا نہ رہے بس چمکے ہی جاتا ہے۔ بادل نہ ہو تو پھر تو کیا کہنا۔ صاف سیدھی طرف آسمان پر جگمگاتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانپے رہیں پھر بھی اندر سے جھلک مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانپنے کا توصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن پورے کر لئے ہوں۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ پلٹا۔ جہاں وہم، وسوسے اور اندیشے گھیر لیں وہاں نہ بیٹی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ، سلیقہ کام آئے نہ تعلیم تربیت۔ عارفہ بیگم کھاتے پیتے بیمار ہو گئیں، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح کھائے جاتی۔

"اکو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اکو ماں کا کیا بنے گا۔؟"

یہ گت تو آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آرہی تھی جب سے کہ سلو میاں جان جوان اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی ننھی منی سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی جو بھرے اندھیرے میں اجالا کرنے کو کافی تھی۔ وہ میاں کا ساتھ تھا، مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمینداری کی آمدنی اور ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر ہوتی تھی۔ اب بھی وہی حال تھا۔ مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جو ان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انھوں نے ساس نند کے دل چھید ڈالے۔ میاں کے دل پھیرنے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت پر جائداد بیٹے کو ملنے ہی تھی، اور ملی بھی۔ اب ماں بہن کا کیا دھرا رہ گیا تھا؟ بس دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑے کی حقدار تھیں۔ وہ بُرے بھلے مل جاتا تھا، نہ بھی ملتا تو کیا کر لیتیں؟ آخر سے کوئی چیز غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوانی کو طعنے پڑتے۔

"دوئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ ٹکریں مار کر کیوں چلتی ہو؟ دودھ کا پیالہ گرا دیا، اب رات کو منّا روئے گا تو کیا پلاؤں گی؟ تمہارا خون؟"

اس پر بس ہوتا تو سہارا جا سکتا تھا، مگر کنواری نند کو ایسے طعنے دیتے بھی نہ چوکتیں:۔

"میری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ دہلیز کی مٹی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں"

عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری بٹیا کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی؟"

"اے لو! سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بٹیا تو بڑی بھولی ہے نا۔ سکھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں؟ کوئی جانتا ہی نہیں جیسے!"

"تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو! کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ باتیں مٹھارے گی۔؟"

دلہن بیگم کو قرار نہ آتا۔ ننھے بچے کے منہ میں چھاتی گھیڑتے ہوئے بولیں:۔

"اب کیا کیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں، میرے بچوں کو یوں بھینچ بھینچ پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کولہے سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان پھلیں بھی کیسے؟"

اختر کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ "بھلا کون پھوپھی ہوگی جو اپنے بھتیجوں سے پیار نہ کرتی ہو گی؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے؟" دلہن بھابی اتنی گہری اور گھنی ہیں، اسے آج پتہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔

"دلہن بیگم خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔ بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں"

"اے لو، طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں؟ جو حقیقت تھی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑوی حقیقت طعنے بن بن دل چھیدتی ہے تو بٹیا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں؟" دلہن بیگم نے جانتے بوجھتے صاف طعنہ مارا۔

"پیدا کرنے والے نے غم دیا ہے بی بی، خوشی بھی وہی دے گا! عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو تھا، مگر اپنے مقدر کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے بھائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹھی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک نہ ایک دن دلہن بن جاتی ہیں اور

پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پر یہ سب گزرتی ہے، مگر بھاوج کے آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیدہ جذبات میں ہلچل سی مچادی۔ رہ رہ کر وہ اپنے سراپے کو آئینے میں جاکر دیکھتی اور سوچتی "ہائے میری بارات کب چڑھے گی۔"

اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دے دیا ہے۔ پھر کون ایسا جی گردے والا تھا کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پُرے گھر کی تباہی کے لئے منحوس کو بیاہ لے جاتا! سامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف لپک رہی تھیں۔

"میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا۔" غم کو ہلکا کرنے کا واحد طریقہ دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آرہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ماں نے بیٹے سے سہمے سہمے کہا: ۔ "بیٹا ظہیر میاں! جوان بہن کا بوجھ سر پر ہے تمہیں فکر نہیں ہوتی؟ کوئی پیام ڈھونڈو نا، آخر کب تک بٹھائے رہو گے؟"

ظہیر میاں نے نوالہ اُٹھاتے اُٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے۔ "ہاں ہر گھر پر اب جاکر دستک دوں گا اور کہوں گا کہ بھئی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کرڈالو نا!"

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

"دوئی بیٹا ایسی جلی کٹی باتیں کاہے کو کرتے ہو، میں نے ایسا کب کہا؟"

"اور آپ کا مطلب کیا ہے؟ بس مجھے اتنا ہی کام تو رہ گیا ہے کہ مشاطہ بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بکتے ہیں کہ گئے اور سیر دو سیر تلوا لائے۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا میاں! ہاں ذرا خیال دلانے کی بات تھی میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی جانتے ہیں کہ سلو میاں کی جوان موت سے اکو ماں پر یہ قہر ٹوٹا، باہر والوں کو مشکل ہی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہہ سُن کر بات لگوا سکو تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے چچا تایا کی اولاد ہیں، یا تو شادی شدہ ہیں یا پھر اکو ماں سے چھوٹی، ورنہ میں آپ ہی منہ پھوڑ کر بول دیتی کہ مری، میری کو اُٹھا لو۔

"بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے؟ ابّا میاں کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں، ہماری برابری کا کون ہے؟"

اماں نے دبی زبان سے کہا :۔

" شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ برابری و رابری کا سوال اُٹھا بھینکو بیٹھے۔ بس شادی ہوجائے۔ یہی غنیمت ہے، لاکھ تمہارے باپ ماں کا نام بڑا تھا مگر شکور میاں کے باپ کون گرے پڑے ہیں! بس غریبی سے مارے گئے، ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں۔ اور میرے خیال سے شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہوگی ؟"

" اماں !" ظہیر میاں بات روک کر بولے " پہاڑ کتنا بھی اونچا ہے، آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے شکور میاں لاکھ امیر کبیر ہوجائیں، ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھاتے کماتے نہیں ہیں، مگر ان کی خود ہی ہمت نہ پڑے گی کہ اس گھر میں پیام لے جائیں جہاں سے ان کی روزی بٹتی تھی۔"

" روزی بٹتی تھی تب بٹتی تھی۔ اب تو اللہ نے ناک اونچی کردی ہے۔ کہنے والے یہی کہیں گے ناکہ عزیز میاں کی بیوی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی، سو کہتے پھریں، ہماری بیٹی تو خیر سے اُٹھ جائے گی۔

کسی زمانہ میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا۔ تب انھوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے وہ کچھ کیا جو ایک باپ ہی اپنے اولاد کے لئے کرسکتا ہے۔ محلے ٹولے کے بچّے اسکول جاتے تو شکور میاں بھس بھس روتے :۔

" میں بھی اسکول جاؤں گا، میں بھی پڑھوں گا۔"

اسکول جانے کے لئے کتابیں لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھما دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آنے لگی۔

" یہ آواز کیسی ہے ؟" وہ حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولے۔

رحیم بیگ ہنسنے لگے :۔ " بی بی باجرے کی بھٹے کہاں سے آئے ؟ وہ حیرت سے بولے۔

" اجی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی وزیر اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے کیسے ؟ روز وہی سبق پڑھاتا ہے اور کبھی ماں سے پٹتا ہے اور کبھی باپ سے۔"

عزیز میاں غصے سے بولے :۔ خود جاہل رہے، اولاد کو بھی جاہل رکھو گے ؟ داخل کرکیوں نہیں دیتے ؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی اس کی پڑھائی میں ؟"

شکور میاں اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ مہینے کے مہینے چپکے سے فیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ، سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ اختر بی کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے طے تھی ورنہ لوگوں نے پہلے تو ٹوہ لگا کر یہی افواہ اڑانی چاہی کہ :۔

"میاں جی بیٹا کے لئے بر ڈھونڈ رہے ہیں۔"

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے اور مہینے کے ختم پر ساڑھے چار سو کے کرکرے نوٹ جیبوں میں ٹھونسے گھر آتے۔ شہر میں گورنمنٹ سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا۔

شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خو بو نہ تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے، جس سے ملیں گے جھک کے، بیٹے سدا اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب بچپن سے ہی آنا جانا ہو تو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ تھا اور نہ کوماں سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا، کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ پتلون اڑائے ہوئے، اونچے پورے وجیہہ، شکیل۔ اپنے میں آپ مرے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ ہوتی۔ کبھی اختر سامنے سے گزرتی تو یوں چھچھلتی نظروں سے دیکھ لیتے جیسے بڑا بیگار ٹال رہے ہوں۔ نہ چہرے پہ مسکراہٹ، نہ کوئی ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے:۔

"آداب عرض!" معاملہ ختم۔

بھلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پڑی بھی کیا تھی کہ ان کے اس سلوک کا برا مانتے۔ ہاں بھئی اگر بیٹی دینے دلانے کا سوال ہوتا تو ایک بات بھی تھی، مگر وہ تو بیاہی جیسی تھیں، مگر اب تو عارفہ بیگم کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے گھرانے کو پتہ تھا کہ بیٹا کی بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے، منحوس تھیں یا مبارک تھیں۔ جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا اگر دولہن بنائے جاتے؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔

اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔ خالہ بی سے ملنے چلے آئے۔ بیٹھے خالہ بی سے باتیں کر رہے تھے کہ اختر اندر سے پان لئے آئی، دھان پان سا جسم، گوری گوری سی رنگت، آنکھیں کٹیلی، چمکتی بجلیاں سی، شاید نہا کر اٹھی تھی کہ بال شانوں سے گر کر ساری پیٹھ پر پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے میں اگر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سلام کیا تو کون جی والا تھا کہ مر نہ مٹتا؟ مگر وہ شکور میاں کہ ایک لمحے کو چونک کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گھبرا کر یوں نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں جل ہی تو جاتیں۔

ایسے ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا آس باندھ سکتا ہے؟

بیٹے اگر کسی لڑکی پہ ریجھ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ "بیاہ کروں گا تو بس اسی سے۔"

تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کرلیں اور بیٹے کی جان کو آئیں تو بات بالکل نہیں بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارنی پڑتی ہے، اگر بنا مرضی گلے میں ڈھول ڈال کر باندھ بھی دیا تو وہ بجائیں گے کاہے؟ کون جانے رحیم بیگ اور ان کی بیوی نے دل ہی دل اختر کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر نگوڑ میاں کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ تو بس خاموش ہی رہیں گے۔

اتنے پر بھی عارفہ بیگم خاموش نہ ہوئیں۔ مانا کہ شہر کی کوئی چہ بانک دل پر چڑھ بیٹھی ہوگی، مگر پھر بھی شادی ہو جائے گی، دو چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل مل جائیں گے۔ گھر بھر جاتا ہے تو منہ نہیں پھیرا جاتا۔

ہیر پھیر سے پوچھا بھی، خود ظہیر میاں کے دوستوں نے بھی ٹوہ لگائی، مگر کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ نہ یہ پتہ چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ چلا کہ پھر آخر کس سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔

اختری بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے تیسے نند اس گھر سے ٹلے۔ ان کی چلتی تو کسی بھک منگے کو اٹھا کر دے ڈالتیں۔ مگر قسمت سے کوئی بھک منگا بھی تو نہ پٹتا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے دونوں کے لئے، چاہے وہ کھانے پینے کی ہو یا اوڑھنے پہننے کی۔ انھیں یہ حصہ داری بھلا یہ کاہے کو بھاتی؟

"دو ئی بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بِتایا کرتیں۔"

اتنی عمر میں تو ہم نے دو بچے پیدا کر لئے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ۔"

محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناطے کیسے باقی رہیں؟ ورنہ مغرور گنائے جائیں، جانا ہی پڑتا، اختری پڑھی لکھی، گنوں بھری، اور پھر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی، اوپر اوپر جھیلی جاتیں۔ گھر والیاں ان کے ذمہ میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار سی بھی وہی کریں، دان دہیز بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ بیٹیاں کام سے منہ کیسے پھیریں۔ ننھی منی دلہنیں، کوئی بارہ کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی، کسی کی بہت ہی عمر ہوگی تو سولہ کی۔ حد ہوگئی سترہ۔ یہ ہونٹوں پر مسی کی تہہ جماتیں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔

"دوئی بہنیں اپنی عمریں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بتایا کرتیں!"

سسرال کا چڑھاوا چڑھاتیں، کالی پوت کا لچھا پہناتیں تو سسناتا تیر آتا:۔

"یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دینا باقی رہ جاتا ہے۔ کرے بھی کیسا بے چاری۔؟"

زمین کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا، بھاوج نے پانی ڈال ڈال کر اُگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی! کیسی کٹھن اور تلخ زندگی! (یہ پودے آگاہی کیوں کرتے ہیں کہ فضول بیج بھری ہواؤں اور جلتے سورج کا سامنا کرنا پڑے!)

(خدا دعائیں نہ سنے، دلی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا یقین ڈگمگا جاتا ہے!) یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے، کفر کا فاصلہ یہاں سے کم رہ جاتا ہے)

گاؤں کی سرحد سے لگ کر ایک ندی بہتی تھی، اُس سے لگ کر کالی مسجد تھی اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار، کہنے والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی اور خصوصیت سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا مانگی۔ دیر سویر، بُرے بھلے بر جڑ ہی گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار کی ایک مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیاز نذریں بھی وہی قبول کرتا تھا۔

اس دن عارفہ بیگم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لا کر پہنائیں تو اختر کا جی ڈوب سا گیا۔ دل خون ہو کر جیسے بہہ اُٹھا۔

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ؟"

ماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا "ایسے ہی منیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔"

مگر وہ مزار کی ہری باریک چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور اختر کا منہ دیکھ کر جیسے منہ پھوڑ کر بول اُٹھی:۔

"نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی ہیں۔ میں ان مالکوں کی بہن لگتی ہوں؟ میں تو تمہارے سہاگ کی مسرت ہوں۔ مجھے توڑو نہیں، مجھے گھورو نہیں۔"

اختر نے بے بسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

"اماں خدا کو نہ بھولئے، وہی سب سے بڑا سہارا ہے، وہی دلوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔"

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر رہ رہ کر کانپتا رہا۔

کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکو ماں کے ہاتھ ٹھنٹھے نظر آئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

"چوڑیاں کیا ہوئیں بیٹا؟" انھوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا

"حمام میں ٹھوکر لگی اور ساری کرچی کرچی ہوگئیں۔ دو ایک باقی رہ گئیں تو میں نے آپ ہی پھوڑ ڈالیں" وہ صاف جھوٹ بول گئی

"ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی۔" انھوں نے چلا کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں ملا کرتا اماں۔ سب قسمت کی بات ہے۔" اس نے رو کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔

"سب قسمت کی بات ہے، سب قسمت کی بات ہے!"

(۶)

عید پر پندرہ دنوں کی رخصت لے کے شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے۔ عید سے پہلے خالہ بی بی سے ملنے آئے، خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا۔ "یہ بار بار میرے گھر کے پھیرے کیوں کرتا ہے؟"

اختر باہر آئی تو شکور میاں نے سہم کر اور پھر چونک کر یوں جلدی سے نگاہیں ہٹالیں کہ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ نگاہیں وہیں جل کر رہ جاتیں۔

نفرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔

"حیا، مروت بھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اٹھ ہی گئی۔ بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کر لیں تو کیا برائی ہے؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھم آجائے بھر جائیں۔ مگر کرے کون؟" انھوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔

ایک دن صبح اختر اماں ناشتہ کرتے کرتے بولی:۔

"اماں رات میں نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا"

"کیا؟" اماں نے لاپرواہی سے پوچھا۔

"نہیں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ اور میں، وہ کالی مسجد کے ساتھ والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں، بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دے کر مجھے ندی میں دھکیل دیا" اس نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلا کر پوچھا:۔ "میں نے؟"

اختر نے سکون سے جواب دیا۔ "ہاں اماں آپ نے"
عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔ واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا۔ سیدھی کروٹ سویا کر۔"
دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی:۔
" اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا، جیسے میں اور آپ مزار کے اونچے چھجے پر کھڑی ہیں اور اک دم آپ نے دھکا دے کر لوٹ دیا" وہ رکی اور ماں کو دیکھتی ہوئی بولی، اور اماں میں چلا رہی ہوں، میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے، مگر آپ نے ایک نہ سنی اور بولیں:۔
" تیرا مرنا ہی ٹھیک ہے" اور مجھے لوٹ دیا، جانے کیسا خواب ہے!" اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑدیں۔
" روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری" انھوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔
اب عارفہ بیگم سدا ئی ادھیڑ بن میں دکھائی دیتیں۔ اختر دیکھتی کبھی ماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھول رہی ہیں، کبھی اپنے آپ میں ہنستی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھنے لگتی ہے۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں:۔
" نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے؟" پھر خود ہی جواب دیتیں:۔
" اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے؟"
ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکایک انتقال ہوگیا۔ مرنے والی اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ مریں:۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہوئیں۔ خلیل خاں کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی، گھر بھی خوب بڑا سارا۔ کھانے والے اتنے جی، بغیر گھر والے کے پتہ بھی ہل سکتا ہے۔ ظہیر میاں ان کے یہاں نوکری تو کرتے ہی تھے، خلیل خاں کو رنڈوا دیکھ کر اپنی بہن کا خیال آگیا۔
" اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ وہ ذرا بوڑھے ہیں" وہ ماں سے بولے
" ذرا بوڑھے ہیں؟" عارفہ بیگم چلائیں، " تمہارے باپ ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا رے میاں تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دیتا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو!"
اک دم ان کے ہونٹ کانپ اٹھے، دل دھڑک اٹھا۔
" اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چھجے پر کھڑی ہیں اور اک دم آپ نے مجھے

لوٹ دیا۔"

ان کے دماغ پر دھیرے دھیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی ۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر......"

اُن کا دل دھڑ دھڑ کر اٹھا ۔ دھک ... دھک ۔ تیز تیز دھڑکن ۔ دھڑ.... دھڑ.... دھڑ.... دھڑ.... پھر دھیمی دھیمی رفتار سے دھڑکتے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

جمعرات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے چھٹکے ہوئے ہی تھے، عارفہ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی ۔ او بٹیا ۔ اکو ماں ۔"

"اوں ۔ اوں ۔ جی ۔" وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

بیٹی اُٹھو تو سہی ۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے ۔"

"جی ۔ کیا؟" وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے ۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں ؟" اس نے چھوٹا سا سوال کیا

"نہیں بیٹا ۔ رجب علی کی بیوی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جمعرات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بالکل پوری ہو جاتی ہے ۔ چل آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے ؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی ۔ بس میں آج یہی منت ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے، سکون دے ۔"

"اچھا چلئے ۔" وہ جوتیاں ٹٹولتی ہوئی بولی، " ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں ۔"

ترل ۔ ترل ۔ ترل ۔ نیچے ندی کا پانی بہہ رہا تھا ۔ ہرا ہرا سا، نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی ۔ مزار کے سب سے اونچے چھجے پر عارفہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں ۔

"بہت سوں سے سنا ہے اندھیرے وقت صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہو جاتی ہے ۔ اور پھر آج جمعرات بھی ہے ۔" اُنھوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا ۔

نیچے پانی بہہ رہا تھا اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں ۔

اختر نے ماں کو دیکھا ۔ اُن کا چہرہ بے جان بے جان سا اور مُتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ "اماں آپ اس قدر پیلی کیوں نظر آ رہی ہیں ؟" اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا ۔

"میں! میرا چہرہ! نہیں تو!" وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں۔ "تاروں کی روشنی میں پیلا نظر آرہا ہوگا" اور بیٹا سچ تو یہ ہے..... وہ سنجیدہ ہوگئیں، کہ ادھر جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات روتے روتے اور فکریں اٹھاتے اٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے۔ اور خون سوکھ جائے تو انسان پیلا نظر آئے تو کیا ہو؟" وہ ذرا سا مسکرائیں، ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا: "فکروں پر جی جلانے کی کیا بات ہے اماں؟ سوچنے سے فکریں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کڑھاتی رہتی ہیں۔"

"ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں۔" وہ نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں: "مگر میں آج خلوص دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دائمی سکون مل جائے گا۔"

انھوں نے بے جان ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انھوں نے اختر کو پوری طاقت سے نیچے کی طرف لوٹ دیا!

اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں قلابازی کھا گیا۔ کچھ دور پر اس کا سر ابھرا، سیاہ بالوں میں چاند ایسا چہرہ چمکا اور ڈوب گیا۔ تھوڑی دور پر پھر اس کا سر ابھرا، پھر ڈوبا، پھر ابھرا، ڈوبا اور پھر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ہونٹ پھیلے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی اُن کے سر پر سے گزر گئی۔ مردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اک دم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

"ارے آپ؟ خالہ بی بی! یہاں ــ ؟" وہ پہچان گیا۔ اک دم وہ خالہ بی کو اُجالے میں لے آیا اور بڑی بے بسی سے گھبرا کر بولنے لگا:

"خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جمعرات کی صبح مانی گئی منتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گاؤں آتا ہوں تب ماتھا رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتا ہوں، مزار پر آکر منتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی! ــ مگر ــ آپ سن رہی ہیں نا؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پر رہنے والا ذرہ آسمان پر چمکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟ ــ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ لوگ کیا سوچیں گے۔ ڈر کے مارے کبھی ابا اماں کے سامنے اشارۃً بھی نہ کہا کہ وہ اک دم میرا دل نہ توڑ دیں۔

بس دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنا کیوں کروں کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا خالہ بی..... آج آپ کو اکیلا پا کر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب مزدور ہوں خالہ بی، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں، مگر آپ یقین مانیے میں اختر کو بہت خوش رکھوں گا، بہت اچھی طرح رکھوں گا۔ آج جمعرات ہے شاید میری دعا قبول ہو جائے!" اس نے کندھا پکڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

"میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجیے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجیے خالہ بی۔"

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بری طرح شور مچانے لگے۔

* * * * * * * * * * *

عیدی

میرے گلے میں ایک بے حد خوب صورت لاکٹ جھولتا رہتا تھا۔ دل کی وضع کا سونے کا یہ لاکٹ کتنوں ہی کی توجہ اپنی طرف کھینچ چکا ہے ____ سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں۔ "یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں چھپا رکھی ہے جو کبھی گلے سے الگ ہی نہیں کرتی ____"

میں مسکرا کر رہ جاتی ہوں ____ ایک غم ناک سی مسکراہٹ۔ کیا لاکٹوں میں صرف پریتم کی تصویریں چھپائی جاتی ہیں؟ یہ کوئی ایسا راز تو نہیں جسے میں زمانے بھر کی نگاہ سے چھپاتی پھروں ____ لیکن میں اکثر یہ سوچ کر رہ گئی ہوں کہ اگر میں نے یہ بتا دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے کیا سجا رکھا ہے تو کیا سننے والے واقعی یقین کر لیں گے؟

آج عید کا دن ہے ____ پتہ نہیں اس دن میں کیا خاص بات ہوتی ہے کہ بھولے بسرے پرانے چہرے بھی یوں رہ رہ کر یاد آتے ہیں کہ دل کلپ کلپ جاتا ہے۔ میری یادوں کے اُفق پر ایک چہرہ عید کے دن خاص طور سے جگمگاتا ہے ____ یوں جیسے وہ چہرہ نہ ہو، چاند ہو جس کی جگمگاہٹ سے دل کا کونا کونا روشن ہو جاتا ہے۔ یہ میری دادی بی کا چہرہ ہے ____ محبت کی شعاعوں سے دمکتا ہوا۔ پیار میں ڈوبا ہوا ____

برسوں پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں جب شاید میں چھ سات برس کی ننھی سی معصوم اور نادان بچی تھی، اس سال عید ہمارے لئے محرم بن کر آئی تھی۔ اس لئے کہ عید سے چند روز پہلے ہماری امّی چل بسی تھیں۔ عید کے دن جو چہل پہل اور خوشی ہوتی ہے اس کا دُور دُور پتہ نہ تھا۔ بس ایسا لگتا ہے ابھی ابھی کوئی میّت اُٹھائی گئی ہے۔ نانی اماں کا اس دن روتے روتے بُرا حال تھا۔ ہمیں نہ عید کے اہتمام میں نئے کپڑے پہنائے گئے، نہ گھر میں اچھے اچھے پکوان پکے، جب محلے ٹولے کے سارے بچّے رنگ برنگ کے کپڑے پہن کر ادِھر اُدھر اُچھل پھاند مچانے لگے۔ اس وقت اچانک اس جان لیوا حقیقت کا انکشاف ہوا کہ آج ہمارے گھر عید نہیں آئی ہے —— جب ہم نے ناسمجھی سے ضد کرنا شروع کی کہ ہم بھی نئے کپڑے پہنیں گے۔ ہم بھی میٹھا کھائیں گے تو نانی اماں نے نوکر کو بُلا کر ہدایت کی کہ ان بچوں کو راحت بوا کے ہاں چھوڑ آ۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

نوکر نے ہماری انگلیاں پکڑیں، اور ہمیں ایک صاف ستھرے لِپے پُتے چھوٹے سے گھر میں چھوڑ آیا —— وہیں میں نے پہلی بار محبت سے بھرپور ایک چہرہ دیکھا۔ وہ نانی اماں کی سہیلی راحت بوا تھیں اور ہماری دادی بی اُنھوں نے ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور گلے سے لگاتے ہی اُن کے مُنہ سے گھٹی گھٹی چیخیں نکل گئیں —— "آج اگر تمہاری ماں زندہ ہوتی" آنسوؤں نے اس کا گلا دبوچ لیا اور وہ پھپک پھپک کر رونے لگیں —— ہم حیرت سے انھیں دیکھ رہے تھے۔ ہماری امّی کے لئے یوں دھاروں دھار رونے والی یہ مہربان ہستی کون ہے؟ ۔ پھر اُنھوں نے سنبھل کر ہماری سہمی ہوئی صورتوں کو دیکھا اور بڑے پیار سے غسل خانے میں لے گئیں۔ مُنہ ہاتھ دھلوا کر اُنھوں نے بے حد پیار سے میرے سر میں تیل ڈالا اور چوٹیاں گوندھنے بیٹھ گئیں —— جب بھیا کی اور میری روتی صورتیں سج سنور گئیں تو اُنھوں نے بے حد پیار سے دسترخوان بچھایا اور کئی طرح کے کھانے لاکر چُن دیئے۔ وہ مُنہ میں نوالے دے دے کر سر پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر ہمیں کھانا کھلاتی رہیں اور جب نیند سے ہماری آنکھیں مُندنے لگیں تو اُنھوں نے کھلے برآمدے میں ہوا کے رُخ پر ایک صاف ستھرا بستر بچھایا اور ہم دونوں بہن بھائیوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا۔

کوئی تین چار بجے کے قریب ہم اُٹھے۔ انھوں نے پھر سے مُنہ ہاتھ دُھلوا کر

زمیں محبت سے سنوارا اور دھوپ ڈھلے جب ہم گھر چلنے کو ہوئے تو انھوں نے دروازے تک ہمیں لاکر چھوڑا ـــ اور جانے سے پہلے پہلے اپنی کمر میں اڑسی ہوئی ایک بوسیدہ سی تھیلی نکالی اور بے حد پیار سے ہماری مٹھیاں کھلوا کر اس میں ایک ایک چونّی رکھی اور بولیں۔ "یہ تمہاری عیدی ہے بچّو ـــ"

میں نے بے حد غیر یقینی انداز سے پہلے اپنی مٹھی میں رکھی ہوئی چونی کی طرف دیکھا اور پھر دادی بی کی طرف پہلی بار شاید میرے ہونٹ کھلے۔ "یہ ـــ یہ، یہ میری ہے ـــ؟"

"ہاں بیٹی بالکل تیری ہے ـــ" پھر وہ بے حد پیار سے میرے سر پہ ہاتھ رکھ کر بولیں۔

"اچھا یہ بتا تو اپنی نانی اماں سے تو نہیں کہہ دے گی کہ میں نے تجھے چونی دی ہے؟"

"بالکل نہیں ـــ" میں نے مٹھی کو مضبوطی سے بند کرتے ہوئے کہا۔ دادی بی جانتی تھیں کہ نانی اماں ان معاملوں میں حد درجہ سخت واقع ہوئی ہیں وہ اس بات کی مطلق روادار نہ تھیں کہ ہم کسی سے ایک پائی بھی لیں۔ بھلے سے وہ عیدی کے ناطے ہی کیوں نہ ہو۔ جب دادی بی مطمئن ہو گئیں تو انھوں نے بڑے رازدارانہ لہجے میں پوچھا ـــ "اچھا بی بی یہ بتا تو ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی؟"

یہ سوال مجھے گڑبڑا گیا ـــ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ نانی اماں نوکر کے ہاتھ میں دو آنے دے کر ڈھیروں سودا لانے کو کہا کرتی تھیں اور وہ زمانہ اس قدر سستے کا زمانہ تھا کہ تھیلا بھر سودا لانے کے باوجود بھی نوکر دو تین پیسے نانی اماں کے ہاتھ میں واپس تھما دیا کرتا تھا ـــ چار آنے میں تو ایک دنیا آ سکتی تھی ۔ اگر گڑیا کا بیاہ ہی رچانے بیٹھ جاؤں تو ڈھیروں چاول شکر، گھی، میوے، پھر گوشت سبزیاں، کیا کیا نہ خرید سکوں گی۔ پوری بارات کھانا کھا کر اٹھ جائے گی تب بھی چیزیں باقی بچ جائیں گی میری سمجھ میں قطعی نہیں آرہا تھا کہ آخر میں اس خزانے کو کس طرح خرچ کر پاؤں گی ۔ بس جی چاہ رہا تھا جلد سے جلد دادی بی کے چنگل سے نکل بھاگوں اور جس طرح بن پڑے اس دولت کو ٹھکانے لگا دوں ـــ اس خیال کے آتے ہی پہلے تو میں نے کچھ شک و شبہ سے دادی بی کے چہرے کو دیکھا اور پھر تیزی سے مٹھی بند کر کے چوکھٹ سے اک دم باہر بھاگی ۔ مجھے اپنے پیچھے دادی بی کی محبت اور ہنسی سے بھری ہوئی آواز سنائی دی، "ڈرتی ہے کہ کوئی اس کی رقم ہتھیا نہ لے ـــ"

اور یہ حقیقت بھی تھی ۔

گھر آنے پر میں اور نئے نئے وسوسوں میں اُلجھ گئی ۔ آخر میں کس طرح یہ رقم خرچ کر سکتی تھی؟ یوں نہیں ـــ میں نے سوچا گھر سے ملی ہوئی جو دُکان ہے وہیں چل کر سوچتے ہیں، اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر خود ہی سوجھ جائے گا کہ کیا لیا جائے، کیا نہ لیا جائے ۔

دوسرے دن جب نانی اماں اپنے کاموں میں مصروف تھیں ۔ میں آنکھ بچا کر گھر سے نکلی اور سیدھی کونے والی دُکان پر جا پہنچی ـــ ایک انگلی دانتوں تلے دبائے میں بڑی دیر تک محویت کے عالم میں دُکان کا جائزہ لیتی رہی ـــ کئی گاہکوں سے نمٹنے کے بعد آخر دُکان دار مجھ سے مخاطب ہوا ، "تمہیں کیا چاہیئے بی بی ـــ ؟ "

میں ہڑبڑا سی گئی ، وہ ـــ وہ کونے میں جو گڑیا ہے وہ چاہیئے ۔"

دُکان دار نے گڑیا نکال کر سامنے رکھ دی اور پھر پوچھا " اور کیا چاہیئے ـــ ؟ "

" اور گڑیا کے گلے کے لیئے مالا ـــ موتیوں والی ـــ "

" چلئے یہ قصہ بھی تمام ہوا ۔" دُکان دار خوش دلی سے مسکرایا ۔

" اب بتایئے ۔"

" کاجو ۔"

" اور ـــ ؟ "

" وہ کھٹی میٹھی گولیاں ۔"

" اور ـــ ؟ "

میں نے جھجک کر کہا " رنگین پنسل ۔"

" اور ؟ "

میں نے کچھ غیر یقینی نگاہوں سے سامان کے ڈھیر کو تاکا ـــ اتنا کچھ خرید لیا اور یہ دُکاندار ابھی تک اور ـــ اور کیے جا رہا ہے ۔ میں نے مطمئن ہو کر کہہ دیا " اب بس ۔"

دُوکاندار نے سامان کا بنڈل بنا کر میرے ہاتھوں میں تھمایا اور ساتھ ہی بچے ہوئے چھ پیسے بھی میرے ہاتھ میں رکھ دیئے ۔

اب میری سمجھ میں آیا کہ دادی بی کیوں پوچھ رہی تھیں کہ بتا بی بی تو ان چار آنوں میں

کیا کیا خریدے گی ـــ تو کیا دادی بی نے واقعی اس قدر رقم حوالے کر دی تھی ـــ ؟ اک دم سے دادی بی مجھے قصّے کہانیوں والی مہربان پری لگیں جو خوش ہو کر جو جی میں آتا بخش دیا کر

میں خوشی سے لدی پھندی گھر لوٹی ـــ سامنے ہی نانی اماں کھڑی مرغیوں کو دانہ ڈال رہی تھیں ۔ میرے پاؤں ٹھٹک گئے ـــ اب تو خوب پٹائی ہو گی ۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب سارا قصہ سُننے کے بعد نانی اماں کی آنکھیں خود بھی آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں " بڑی نیک بخت بی بی ہے ـــ خدا دونوں جہاں میں اس کی نیکیوں کا صلہ دے ۔ گوشت پوست سے نہیں محبت سے بنی ہوئی عورت ہے راحت بوا ـــ"

نانی اماں کے ان الفاظ سے میرے دل میں دادی بی کی محبت اور قدر دُگنی تگنی ہو گئی ۔

اگلی عید پر بھی ہم دادی بی سے ملنے گئے ۔ وہ اُسی تپاک سے ملیں جیسے سال بھر ملتی رہتی تھیں ۔ اور اس عید پر بھی اُنھوں نے وداع کرتے ہوئے اپنی بوسیدہ سی تھیلی میں سے چونی نکال کر دی اور اسی رازدارانہ لہجے میں پوچھا ۔

" بتا بی بی ان چار آنوں میں تو کیا کیا خریدے گی ـــ ؟ "

⁂ ⁂ ⁂

کتنے سال ایک ایک کر کے یوں ہی گزر گئے ۔ زمانے کے انداز بدلتے رہے مہنگائی بڑھتی رہی ـــ پھر جنگیں ہوئی ۔ دنیا کے نقشے بدلے ـــ ہندوستان پاکستان آزاد ہوئے ۔ ایک نئی دنیا کی داغ بیل پڑی اور ہم بھی اپنے آبائی وطن کو چھوڑ کر پردیس میں آ بسے ۔ اب تک زندگی میں کوئی لمحہ خوشی کا میسّر نہ آیا تھا ۔ وہی غربت ، وہی تنگی ۔ وہی حالات ، ـــ سوچا تھا کہ نئی جگہ شاید نیا آب و دانہ بدلے گا ، لیکن قسمتیں بھی کبھی بدلا کرتی ہیں ؟ پردیس آ کر مصیبتوں کی داستان اور بھی دردناک اور طویل ہو گئی ۔ عید آتی تو اور بھی یاد آتا کہ کس طرح دادی بی چار آنے دیا کرتی تھیں جو ایک مدّت کی خوشی کا سامان ہو جاتے تھے ۔ پردیس آ کر اس دولت سے بھی محرومی ہو گئی ۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

پھر کچھ سال اور گزرے ـــ اور زمانہ اس تیز رفتاری سے بدلا اور مہنگائی بڑھی

بڑھی کہ چار آنے تو کیا چار روپے بھی حقیر رقم معلوم ہونے لگی۔ بچپن میں سال بھر عید کا انتظار واقعی عید کی طرح رہتا تھا۔ اب عید آتی تو سادے دن کی طرح یوں ہی گزر جاتی ــــ لیکن یہ ضرور تھا کہ کسی بھی عید کو دادی بی کی یاد نے ساتھ نہ چھوڑا۔

وقت نے ایک اور بھرپور انگڑائی لی اور میری شادی ہوگئی ـ گویا زندگی بھر کی تمام کلفتوں مصیبتوں کا خاتمہ ہوگیا ــــ یہ یقین پختہ تر ہوگیا کہ خدا مصیبت کے بعد راحت اور خزاں کے بعد بہار ضرور دیتا ہے۔ میرے شوہر بڑے بزنس مین تھے ۔ روپے پیسے کی کوئی قدر ہی نہ تھی۔ جنّت کا ہمارے ذہنوں میں یہی تصوّر ہے نا کہ جس چیز کی تمنّا کرو آموجود ہوتی ہے۔ تو مجھے جیتے جی گویا جنّت مل گئی تھی ـ پھر جب خدا نے اس چمن میں ایک نوشگفتہ کلی اور پھر ایک پھول بھی کھلا دیا تو زندگی سچ مچ ہی بہاروں اور جنت کا حقیقی روپ ہوگئی۔

دنیا وہی تھی ــ یقیناً دنیا کی مشکلات بھی وہی ہوں گی ۔ لیکن میرا یہ حال تھا کہ کبھی ایک گاڑی ایک سال استعمال کرلی اور اس سے جی بھر گیا تو یوں ہی خرید لی جیسے بیس ہزار کی نہ ہو بیس روپے کی بات ہو۔ شہر اور میدان میں رہتے رہتے جی اوب گیا تو پہاڑوں پر گرمیاں گزارنے چلی گئی ۔ تقریباً ہر ہل اسٹیشن پر ذاتی گھر انھوں نے خرید رکھے تھے اور ویسے بھی رہنے کے لئے بمبئی جیسے شہر میں اتنی بڑی کوٹھی تھی کہ چلتے چلے جاؤ مگر کوٹھی ختم نہ ہو۔ اب عید آتی تو ان ہنگاموں کے ساتھ کی خریداری شروع ہوتی تو ختم ہوتے ہی میں نہ آتی اور گھر یوں بھر جاتا کہ لگتا کہ دکانیں کی دکانیں گھر میں لا ڈالی ہیں۔

اسی طرح چند سال اور گزرے اور پھر اچانک ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے برسوں بعد وطن عزیز میں عید منانے کا موقع ملا ــ جب ہم اپنے آبائی مکان میں اترے تو ایسا لگتا تھا کہ یہ گھر نہیں روحوں کا ویران مسکن ہے۔ محلے ٹولے کے پرانے لوگ جانے کدھر جا بسے تھے ۔ لے دے کر گھر میں ایک پرانے وقتوں کا بوڑھا مالی رہ گیا تھا جو سر شام ہی ننھّا سا میلا دیا جلا کر راہ داری والے طاقچے میں رکھ دیتا ــ پرانے دن پرانی باتیں گزری ہوئی گھڑیاں یاد آ آ کر دل کو جیسے مسوسنے لگیں۔ شہر ہوٹلوں اور بڑے بڑے ریسٹورانوں سے بھرا پڑا تھا ــــ یہ کیا ضرور تھا کہ ہم اسی مزار جیسی ویران حویلی میں عید مناتے لیکن میں نے سوچا پرانی یادوں کو تازہ کر لینے میں کیا حرج ہے۔

جب وہ عید کی نماز پڑھ کر لوٹے تو میں سراپا بہار بنی کھڑی تھی۔

"اوہ ـــــ یہ ٹھاٹھ ہیں!" اُنھوں نے پیار سے چھیڑا۔ "قیامت نظر آرہی ہو ـــ کہاں کی تیاری ہے ـــــ؟"

میں نے ایک نظر اپنے آپ پر ڈالی ـــ یہ ساڑی گیارہ سو میں اُنھوں نے خاص طور سے مجھے عید پر پہننے کے لئے دلائی تھی ـــ یوں چمکتی جگمگاتی مانو آگ لگی ہے۔ کانوں میں ہیروں کے دمکتے ہوئے لانبے لانبے جھمکے۔ ہاتھوں میں ساڑی سے میل کھاتی ہوئی اصلی زمرّد کی چوڑیاں۔ گلے میں جڑاؤ ہار، ناک میں تارے کی طرح جگ مگ کرتی ننھی سی لونگ۔ میں دُلہنوں کی طرح بھرپور انگشتریاں اور پیروں میں نازک نازک پچیلیاں جو سونے کے تاروں کی بنی ہوئی تھیں ـــ

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور ہنس کر بولی "تیاری؟ ہاں تیاری ہے تو سہی اور ایک بہت اہم ہستی سے ملنے کی ہے ـــ"

"ذرا ہم بھی اس خوش نصیب کا نام سُنیں" وہ شرارت سے بولے۔

میں بچوں کی سی معصوم خوشی سے بولی ـــ "آپ سُن بھی لیں تو اُس کی اہمیت کو نہ سمجھ پائیں گے" پھر قدرے رُک کر بولی "وہ مری دادی بی ہیں۔"

"تمہاری دادی بی ـــ؟" وہ حیرت سے بولے ـــ "مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہاری دادی بی کے انتقال کو تو ایک مدّت ہو چکی ہے۔"

"ہاں لیکن یہ دادی بی سدا میری رگِ جان سے بھی قریب رہی ہیں۔ آپ ملیں تو سہی پھر کہئے گا کہ ایسی محبت والی ہستیاں صرف کتابوں ملتی ہوں تو ہوں ـــ اس دنیا میں تو مثال ناممکن ہے۔"

اُنھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور بنا کچھ کہے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

ہماری لمبی کار رن کر کے ایک بوسیدہ سے مکان کے پاس سے گزری اور میں نے ذرا چلّا کر کہا "بس بس...... روک دیجیے... یہی میری دادی بی کا گھر ہے۔" کار ایک نرم سے جھٹکے کے ساتھ رُکی اور کار کے رُکتے ہی بہت سارے بچّے بھی وہاں آ کر کھڑے ہو گئے اور حیرت سے گردنیں اونچی کر کے دیکھنے لگے۔

میں جیسے ہی گھر میں دا ہوئی ایسا لگا کہ کسی محل سے نکل کر ماچس کی ڈبیا میں بند ہو گئی ہوں۔ ایک پرانی سی بو نے میرا استقبال کیا اور ہلکے ہلکے اندھیرے سے جب میری آنکھیں مانوس ہو گئیں تو میں نے دیکھا کہ کونے میں ایک مڑی تڑی گٹھری سی پڑی ہے۔

"کون ہے — ؟" پاؤں کی چاپ سن کر ایک کمزوری آواز نے سر اُٹھایا۔

"ارے یہ دادی بی ہیں" میں نے دُکھے دل سے سوچا۔ بڑی ہمت جمع کر کے آواز نکالی "دادی بی میں ہوں — آپ کی بی بی"

یوں جیسے ذہن پر زور ڈال کر انھوں نے سوچنا شروع کیا ہو — پھر خوشی سے لرزتی آواز میں انھوں نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے — "اری بی بی تو — ؟ آمنہ بوا کی نواسی ہے نا تو — ؟" گویا انھوں نے یقین کر لینا چاہا ہو۔

"ہاں دادی بی میں ہوں نا — آپ مجھے بھول گئیں"

شرمندگی کے ہلکے سے غبار میں لپٹی اور دُکھ میں ڈوبی آواز میں وہ بولیں۔

"نہیں بی بی تو کوئی بھولنے جیسی چیز ہے۔ مگر برس بھی کتنے گزر گئے۔ کم بخت آنکھیں بھی تو جاتی رہیں —"

میرے دل پر ایک گھونسہ سا پڑا — میں سہم کر بولی۔ "دادی بی آپ کو نظر نہیں آتا — ؟"

"نہیں بی بی — بس اب تو آنکھوں کے آگے مستقل رات کا سا منظر ہے۔ اندھیرا ہی اندھیرا ہے — وہ ذرا ہنس کر بولیں — "اور بی بی اب دنیا میں دیکھنے کے لئے رہ بھی کیا گیا ہے۔ اپنے بیگانے ایک ایک کر کے سارے مر کھپ گئے یا پاکستان چلے گئے مگر اتنے دنوں میں آج دل چاہ رہا ہے کہ آنکھیں ہوتیں تو اپنی بی بی کو ایک نظر دیکھ تو لیتی۔

تیری شادی وادی ہو گئی یا نہیں بی بی — ؟ وہ محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

دکھ اور شرم سے بوجھل آواز سے میں بولی۔ "جی ہاں دادی بی — ہو گئی ہے"

"بچے وچے ہیں — ؟"

"ایک لڑکا ایک لڑکی ہے۔"

"ساتھ نہیں لائی"

نہیں بی — بمبئی میں گھر پر ہی ہیں۔"

"چلو اچھا ہوا" وہ سکھ کی سانس لے کر بولیں۔ "بن ماں کی بچّی تھی ٹھکانے سے بیٹھ گئی۔" ایک دم جیسے انھیں کچھ یاد آیا — وہ مجھے ہاتھوں سے ڈھونڈتی ہوئی بولیں — "پر میرے لئے تو تو ابھی بھی بچّہ ہی ہے۔ اب تو کچھ سوجھتا بھی نہیں ورنہ تیری کنگھی تو بھی کر دیتی — آج عید کا دن ہے نا — ہر عید کو میں تیرے بال سنوارا کرتی تھی۔ یاد ہے نا —"

میں نے گردن سے اونچائی پر بندھے اپنے بڑے سے جوڑے کو محسوس کیا جس میں جمپا کرن کا سونے اور موتیوں کا کلس جگ مگ کر رہا تھا اور سہم کر بولی۔ "دادی بی اب تو میں بہت بڑی ہو چکی ہوں۔"

"ہاں بی بی پر میرے لئے تو تو آج بھی وہی ننھی سی بچّی ہے جو میرے ہاتھوں کے بنے نوالے کھا کر میرے بستر میں ہی سو جایا کرتی تھی۔" ایک دم اُنھوں نے بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھ کر کسی کو پکارنا شروع کیا۔ "اری زینو، او زینو — کچھ سوئیاں میٹھا ہو تو یہاں دے جا — میری بی بی آئی ہے۔" شاید وہ اپنی پڑوسن کو آواز دے رہی تھیں۔

ہائے یہ مجبور بڑھاپا — اور یہ محبت! میرا دل اندر سے رو اُٹھا، میں خود کو سنبھال کر بولی — "آپ تکلیف نہ کیجئے دادی بی — مجھے بالکل بھوک نہیں ہے بس آپ بیٹھی باتیں کیجئے آپ سے ملے اتنے دن ہو گئے کہ جی چاہتا ہے بس آپ سے باتیں کئے جاؤں۔"

"ہاں بی بی — وہ دکھ سے بولیں "اب تو بڑی ہو گئی۔ تو عقل مند بھی ہو گئی۔ کوئی میرے پکارنے پر پلٹا نہیں تو تو نے کہہ دیا کہ مجھے بھوک نہیں — میں کیسے مان لوں کہ تجھے بھوک نہیں ہے۔"

ماحول اس درجہ دردناک ہو گیا تھا کہ مجھے اپنے آنسو روکنا دوبھر ہو گیا — کتنی ہی خاموشی چھائی رہی مانو جگ بیت گئے ہوں۔ پھر میں خود کو سنبھال کر بولی۔ "دادی بی یہاں تو آپ کی دیکھ ریکھ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ آپ میرے ساتھ میرے گھر بمبئی چلئے نا۔"

وہ کرب ناک انداز سے مسکرائیں۔ "بی بی جانے والی ہوتی تو پاکستان نہ چلی گئی

ہوتی۔ ایک ایک نے خوشامد کی مگر مجھے میری مٹی عزیز ہے۔ اب تھوڑے دن رہ گئے۔ کہاں جاتی پھروں گی ــــ بس خدا عزت سے اُٹھالے، یہی دعا ہے۔" پھر وہ کچھ یاد کر کے بولیں۔ "تیری نانی تو ابھی ہیں بی بی۔"

"ہاں دادی بی ــــ وہ بھیّا کے پاس رہتی ہیں۔"

جس در و دیوار کے سائے تلے اور جس محبت بھری آغوش میں ہمیشہ میں ایک سکون پایا کرتی تھی آج وہیں مجھے کانٹوں کی سی چبھن محسوس ہو رہی تھی۔ اک درد سا دل میں اُٹھ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا چیخ چیخ کر روؤں مگر آنسو بھی جیسے مونہہ چھپا کر کہیں بیٹھ گئے تھے۔

"اچھا دادی بی اب میں چلوں ــــ" بڑی دیر بعد بڑی ہمت باندھ کر میں اتنا جملہ کہہ سکی۔

اچھا خدا تیرا نگہبان ہو بی بی ــــ وہ ٹوٹی آواز سے بولیں ــــ ایک دم اُنھوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔

"مگر ذرا ٹھہرو ــــ اپنی عیدی تو لیتی جا ــــ" اتنا کہہ کر انھوں نے ٹٹول ٹٹول کر اپنی بوسیدہ سی تھیلی کمر سے نکالی اور اس کے اندر بہت دیر تک انگلیاں گھنگھولنے کے بعد ایک سکّہ نکال کر مجھ سے تصدیق چاہی۔

"دیکھ تو ذرا یہ چونی ہی ہے نا ــــ؟"

میں ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی ــــ پھر اُنھوں نے اٹکل سے میرا ہاتھ تھاما اور میری بند ہتھیلی کھول کر چونی اُس میں رکھ کر پھر سے مٹھی بند کر دی اور بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں پوچھنے لگیں۔ "اچھا بی بی ان چار آنوں میں کیا کیا خریدے گی ــــ؟"

پہلی بار میں خدا کا شکر ادا کیا کہ دادی بی کی آنکھیں چلی گئی ہیں، ورنہ اگر دادی بی یہ دیکھ لیتیں کہ میرے جسم پہ ہزار بارہ سو کی ساڑی ہے۔ بدن زیورات سے بوجھل ہے۔ سر پہ سونے کا کلس جگ مگ کر رہا ہے اور میں بڑی سی کوٹھی سے اُٹھ کر اتنی لمبی چوڑی کار میں بیٹھ کر ان سے ملنے آئی ہوں کہ شرک کار سے یہاں سے وہاں تک لبالب بھر گئی ہے تو ــ تو ــ تو ــ!

اب ضبط کی ہر حد ختم ہو چکی تھی۔ میں ننھّے بچوں کی طرح کھلے دل سے چیخ چیخ کر رونے لگی۔ محبت کا وہ عظیم عطیہ وہ چونّی جو لاکھ خزانوں پر بھاری تھی۔ میری ہتھیلی پر لرز رہی ــــ میں

ان چار آنوں سے کچھ بھی نہیں خریدوں گی — میں ان چار آنوں کو کبھی خرچ نہیں کروں گی۔ کیونکہ یہ تو وہ عظیم رقم ہے کہ چاہوں تو اس سے ساری دنیا خرید لوں، لیکن میں یہ کیسے گوارہ کر پاؤں گی کہ اس دولت کو خود اپنے ہاتھوں سے کسی اور کو دے دوں — یہ چونّی کسی دوکان دار کے ہاتھ میں نہیں جائے گی دادی بی — یہ سدا میرے دل میں تعویز بن کر رہے گی۔

میں نے یہ سب کہنا چاہا لیکن آنسوؤں کی تیز بوچھار میں الفاظ ساتھ نہ دے سکے۔

⁂ ⁂ ⁂

سکھی سہیلیاں مجھ سے چھیڑ سے پوچھتی ہیں۔ یہ کیا اپنے پریتم کی تصویر اس میں سجا رکھی ہے جو کبھی اس لاکٹ کو گلے سے الگ ہی نہیں کرتی —؟

لیکن میں یہ سوچ کر جواب دیتے دیتے رہ جاتی ہوں کہ اگر میں نے بتا بھی دیا کہ اس لاکٹ میں میں نے یہ کیا سجا رکھا ہے تو سننے والے کیا واقعی یقین کر لیں گے —؟

••

شہر ممنوع

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک کالا کالا تل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہو سکتا ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے، اس کے اتار پر کسی خوبصورت سے نشیب میں کوئی چم چماتا تل ہو۔ جیسے ادھر اُدھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انھوں نے کہہ سن کے اپنی اماں کو راضی کیا اور پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروالیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی نا اگر اس دن مدن میاں کا آدبدا کے نماز پڑھنے کو جی چاہ جاتا۔

لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں انھوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اٹھایا ____

پانی بھرا اور وضو بنانے بیچ آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔

دیوار سے لگ کر بیری کا چھتنار درخت تھا۔ جس پر دنا دن پتھر برس رہا تھا۔ ایک بیر ٹپ سے آکر ان کے سر پر پڑا، انھوں نے سر نہوڑا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آکر ان کی پیٹھ پر گرا۔ انھوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر ایک آدھ گالی بکنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک

پر آگرا۔ اب تو ان کا ڈھول چھلک گیا۔ چلا کر بولے :۔

"یہ کون تیس مار خانم ہے یہ ___؟ ٹانگ سیدھی کر دوں گا ابھی آ کے ۔!"

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی مستی کوئی نہیں مچاتا۔ دھوپوں کی سنسناتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں، یہ چھوکریاں سدا کدکڑے لگاتی پھرتیں۔

مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی نوری آئی ___ نیلی شلوار جس کے پائنچے پڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا، لال اوڑھنی۔ آتے ہی بولی :۔

"ہاں ہاں جھڑائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی ___؟ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے ۔"

"اچھا ___ تیری اتنی بڑی زبان ___؟ ٹھہر تو سہی ___"

مدن میاں بڑی گرمی میں آستین چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی ___ مگر وہ تو ویسے ہی تنی کھڑی رہی۔ انھوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی

"اب بول ___ کرے گی زبان درازی ___ ایں ___؟"

"اوں ___ اوں ___" وہ چلائی ___ بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن بھی لے کے۔ اتنا مارا اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی۔ ابھی اماں سے جا کر کہتی ہوں ۔"

مدن میاں سٹ پٹا گئے۔ "یہ پرکالہ چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے" ذرا نرم پڑ کر بولے :۔

"کہاں مارا تمہارے میں نے ؟"

"ہاں ہاں ___ اس دن آنگن میں ___ "چڑی چھپاکا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا بنڈا پھینک کے مارا تھا ___ ؟" ایکدم وہ تیکھی ہو کر بولی ___ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے ___ ؟"

مدن میاں صاف مکر گئے۔ "جھوٹ بکتی ہے۔ میں نے تجھے تو تجھے کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا ۔"

"اوں ___ جھوٹے کہیں کے۔ یہ دیکھو تو ___" اور اس نے جھٹ اپنی نیلی شلوار کا پائنچہ گھٹنوں تک چڑھالیا۔

"یہ دیکھو۔ یہ نیلا نیلا نشان۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی۔ جی ___ ہاں ___!"

"وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور یہاں دل چوٹ کھا گیا۔ بڑی اُجلی اجلی، دھلی دُھلی سی پنڈلی تھی ___ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی۔ نیل ویل کچھ بھی نہ تھا، ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ___ کالا کالا۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے مٹولے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے ___ وہ پیر پٹختی، تینوں سر سیٹتی، اپنی لال لال اوڑھنی کا آنچل لہراتی یہ جا ___ وہ جا۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہیں کھڑے رہے۔ عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

ایک تھی شہزادی

"ہا ___ بیچاری ___" دادی بی کو شہزادی پر بڑا ترس آیا۔ سروتہ تھم کر وہ ساکت سی ہو گئیں۔

"تو آگے ہوا کیا ___؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

"ارے ہوتا کیا ___؟ نصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو ___!"

"بھئی اللہ ___ دادی بی ___ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ مچ کی ہوئی شہزادی تھی جیسے ___ پھر آگے سنایئے نا ___"

"کیا سناؤں ___؟ مجھے نیند آ رہی ہے اب۔" دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

"دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیئے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے پھر لیتی رہیئے گا جمائیاں ___ ہاں!"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑی۔

"اے ہے بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس مارا کھڑا ہوگا، تبھی تو۔ اب آ جا کے رانی کو یہی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے ہی سے نکاح پڑھوا دیں۔ اے کرتی بھی کیا بیچاری! ماں جو کتے جا رہے تھے شہزادی کے۔ اِدھر رانی چپکے راجہ کی جان کھائے جاتی:۔

"اجی سنتے ہو! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے ——؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہولیں، تب اٹھانا۔ ہاں آگے تم جانو۔"

"مگر اجہ کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا۔"

"تو دادی بی، —— بیچ میں شجو میاں نے بات کاٹی —— "آخر اس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے ——؟"

"اے لو اور سنو —— کہانی کا انجام پہلے ہی سے سنا دیا تو کیا مزہ رہا ——؟ ویسے تھی نصیبوں کی پوری بیچاری۔

"ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے کہ ایک دن......"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی بی چچی سے بولے :-

"اجی سنتے ہو بھابی جان! وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی۔"

"ہائیں ——؟ کیا کہتے ہو میاں ——؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں —— "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا ——؟"

"ہو سکنے کی بات تو جانے ہی دیجئے —— ہو چکا ہے!"

بڑی چچی چڑ کر بولیں: —— "موئی گن کی نہ ڈھنگ کی، کس بات پہ ریجھ گئے صاحبزادے! سارا دن تو گلی کے لونڈوں کے ساتھ ہڑبونگ مچاتی پھرتی ہے۔ لو کیسا زمانہ آ لگا ہے بچپن کی نسبت بغیر پوچھے گچھے توڑ پھینکی۔ موئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہو گئی۔ جب دل چاہا اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے ——؟"

"بھائی جان —— اب پسلی کا جوڑ تھا مل گیا۔ جو ہوا سو ہوا مگر اب ہماری شجو ماں کا کیا ہوگا ——؟ اور پھر شجو ماں کی وجہ سے ربو ماں کا کیا بنے گا؟ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پر کھڑے ہیں۔ جیسے تیسے انھیں تھاپ دے دے کر انھیں روکے ہوئے تھے۔ اب تو وہ صاف کہہ دیں گے —— نا بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا میرے جڑے ہیں ستارے بیٹی میں کیوں جھوٹ کہتا ہوں ——؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجو میاں کی طرف دیکھا۔ جو بد نصیب شہزادی کی کہانی آنکھوں میں نمی سے سن رہی تھی۔

گرتی دیوار

ابھی شجو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکی ہو گئی۔ ربو، جو شجو ماں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی۔ ابھی بالکل ہی گڑیا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگنی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجو ماں کی مدن میاں سے نوکا جھونکی چلتی رہتی۔ پہاڑے یاد ہوتے رہتے اور مدن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے رہتے اور ہنس دیتے۔ بڑی چچی کہتیں :۔

"اے ہمارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونے والی دلہن کو گودوں میں اٹھائے پھرتے رہتے ہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہئے میاں بی بی کی عمر میں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے ؟۔ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہو گئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اسی سے تو ناچاقی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ ــــ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی ہنڈی تو تیار ہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو عورت کہاں پائے۔"

مدن میاں اور شجو ماں کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا۔ سب کے ساتھ شجو ماں بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انھیں مدّن بھائی کہتی، مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹھوکا دے ہی دیتا :۔

"اری کل جبھی! بھائی پکارتی ہے ہونے والے دولہا کو۔"

اب شجو ماں کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دلہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دلہے کے نام پر شرمایا جاتا ہے۔ بس وہ گٹھڑی سی بن جاتی۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے، گویا بڑی انوکھی بات کر رہے تھے، مگر ساس سسرے خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنستی لونگ کی طرح عنقا تھے۔ اب یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شجو ماں کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ۔ گنوار کاٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سوٹ نبھے گی ۔؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی مگر ربو خیر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی ہے۔ دو کتابیں اردو کی۔ اور پھر دس

نمک پہاڑے بھی — تو یاد تھے اُسے !

ادھر شجو ماں نے سولہویں میں اور ربّو نے تیرہویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربو کے سسرال والوں نے اودھم مچادی۔

"اے ہے دیکھو تو سہی! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے۔ آخر کب اُٹھانے کا ارادہ ہے۔"

پیغام تو دونوں کے موجود تھے۔ مگر مدن میاں کی اماں کہتی تھیں، اماں کیا کہتی تھیں، خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ ایل۔بی کی خلعت پہن لیں — پھر کریں گے شادی وادی بھی — ربّو کے سسرال والوں نے کیا کیا گھائیاں نہیں گھالیں —؟

"اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر کی مٹی اُٹھا کر۔ نوج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے باندھ رکھا ہے، پھر ڈھلتی بھی اُٹھانا ہے۔"

بڑی چچی نے انھیں بڑی صلاحیت سے ٹلوا دیا —

"بات کرتے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منڈوے ساتھ ہی ساتھ پڑیں گے۔ اَے بہن —! تم اپنی ہی والی ہو، ذرا سوچو تو سہی۔ چھوٹی کو وداع کر کے بڑی کو نہ اُٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے، میرے منہ پر کہ ہوگا بڑی میں کوئی عیب، تبھی تو چھوٹی کو اُٹھادیا۔ اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک ہی مجبوری ہے۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں۔"

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں اگر بڑے نیدھے بن گئے ہیں — کیا کیا جلاپے انھوں نے بڑی چچی کو نہیں دیئے؟ بس کھولتے پانی میں ڈال کر جوشش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اُٹھاتیں۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ:—

"بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چرکے بھی لگائے تھے دست پناہ سے۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ "بات" وہی ایک بات، عشق اور محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں، اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی حوا کی کھوج کی تھی، یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی پکے پان جیسی اجلی بھانجی کے لئے وقف تھے۔ اب بہن دل پر کس کا بس چلا ہے —؟ یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے۔ وہیں

جھونپڑیاں پر کوے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو کیا گیا، برس پیچھے وہ ضرور ایک ڈالی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کروں گا تو تجھی سے، ورنہ زہر کھا لوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا۔

"اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ" اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں بہت ہوا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا"۔

مگر کھلے بندوں چھٹی تو انہوں نے بھی نہ دی۔ سید تھے۔ بات کیسے گرنے دیتے۔؟

بڑی بی بی بیاہ کر بھی آگئیں، مگر میاں کے تیور وہی رہے۔ اب بھی لپ جھپ کر جھونپڑیا پر جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ بچے بڑی بی بی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں۔ کبھی منہ سے نہ پھوٹتیں۔ جو جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔

"اے واہ، یہ اچھی سنائی بوا۔ کیا محبت نہیں، پیار پیرت نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوتے"۔

بڑی بی بی ایک بار تو جل کر بول گئیں:۔ "اے بچوں کا نہ کہو۔ بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں، ہمارا کیا ہے۔؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ بڑی دلہن نے تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہو گی۔ یہاں تو یہ حال تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا دیتے اور مارے باندھے کے جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج شام کو تو ڈھلتا ہی ہے۔ دن بھر کتنا جگمگائے۔ اب تو رزاق میاں راستے پر آگئے تھے۔ جھونپڑیا والی سے بھی تنپھے اور تین تین بچے ہوئے مگر چچوڑی ہوئی ہڈی کو کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے۔؟ دودھ جیسا بے داغ اور سنگ مرمر ایسا بھرپور ملا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا۔۔۔۔ دے گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اتر گئی۔ گاؤں کے حاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پرچول کرتا پھرتا۔

یوں تو ربو کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے۔ مگر ادھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی بی بی کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اب تو کوئی ٹھور ٹھکان بھی نہ تھا۔ منگی ہوئی لڑکی کا پیغام ٹوٹ جانا یہاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلا جننے والی اس سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی

تو پوچھے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی ۔؟ پھر وہ غیر کف والے ہی بیاہ لے جائیں ، ــــ بیاہ لے جائیں ۔ اپنے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے ۔ بلکہ موقع ملے تو اور پردے اٹھاتے ۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آپڑا تھا ۔ ربو ہوتی تو ایک بات بھی تھی ، وہ پھر بھی چھوٹی تھی ۔ پہلے تو شجو ماں یوں ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا ۔ بڑی بی تو افسوس ہوتے بھی پاگل ہو کر رہ گئیں ۔ بلو پیار لپسار کے من میاں کی کرمل جوانی کو کوسنے دیتیں ۔ پھر آجا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں

" اے بی ہمیں سب معلوم ہے ۔ آج کل ہوا ہی چلن ہو گیا ہے ۔ کھلے بندوں ، چڑھاوے کے بیلوں کی طرح جوان ہیلاٹ لڑکیاں چھوڑ دیتے ہیں ۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ پڑے گی اور من مانی کریں گے ۔ کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ گدکڑے لگاتی پھرتی ہیں ۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا ، ہے تو نامحرم ۔ معلوم ہے جی ، یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی ــــ "

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شجو ماں کی تقدیر کی سیاہی بن کر ان کے وجود کو کھا گیا ! مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا ۔ ! چڑا تو ہاتھ سے اڑ گیا تھا ــــ !

" کاگا رے کاگا ــــ تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے بھاگوں کوئی مہمان آنا ہو تو ــــ تو ــــ اڑ جا "

" ہائے بیچاری شہزادی ، روزانہ محل کے چھجے پہ کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی ۔ سیکڑوں کوے منڈیر پہ بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے ، کوئی بھی تو نہ اڑتا ۔ "

" ہائے ۔ تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہوگا بھلا ــــ ؟ "

یہ ربو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی ۔

" پھر مجھلے اٹک دیا نا ! اری کلموہی ، کوے کو پکار کر ، اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دے کر اس سے پوچھو ، میرے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے ــــ ؟ اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا ، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں ۔ اڑے بھی تو سندیسہ کیسے دے ۔ ہاں ، اب سے بیچ میں نہیں بولنا ۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی ، مگر اس کے نصیب کھلنے تھے نہ کھلے ۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی ۔ اللہ کا نام ہزار اس

کا کام پڑا ۔۔۔ ایک دن ۔۔۔"

"یہ شہرِ ممنوع کیا ہوتا دادی بی ۔۔۔؟" شجو ماں نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا۔

دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا، مگر چونکہ شجو ماں بہت کم کوئی سوال کرتی تھی، اس لئے پیار سے بولیں:۔

"اے تم یہ سمجھی کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جا سکتے تھے، جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آجاتے تھے۔ اور پھر وہ شہر ان کے لئے شہرِ ممنوع نہ رہ جاتا تھا۔"

"تو دادی بی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی۔"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام؟ شہرِ ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا۔ کھلی بستی ہوتی تو کیا بیاہی، کیا ان بیاہی، سبھی دھول اڑاتی پھرتیں، مگر وہ تو شہرِ ممنوع تھا۔

"توبہ ہے، بیچ بیچ میں سور خنے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ ......"

اسحاق میاں ہمیشہ کلائمیکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے:۔

"اجی سنتی ہو بھابی جان! وہ ممو میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلد ہی شادی نہ کی تو سمجھو پیام ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائیں! ۔۔" بڑی بی چھپکیاں سی لے رہی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔

"ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔۔۔؟"

"ہو سکنے کی بات جانے دو، اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھیکتی رہنا۔ میں کہتا ہوں کہ ہی دونا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بیچاری کے نصیب تو دغا دے گئے۔ تم ہی سوچو ۔۔۔۔۔۔ ایک تو یوں ہی بیٹھی ہی ہے۔ دوسری بھی چھاتی پر مونگ دلے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں ۔۔۔!

"نا میاں ۔۔۔۔۔ تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو شجو ماں بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر بار برت رہی ہے۔ بچے جھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی؟"

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی باغ کا شہزادہ آہی

جائے گا۔ ہم ایک گنا فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو میٹھی رہے گی تمہارے کولہے سے لگ کر ـــــــ تنکر میں دب کر گھوڑا مر نہیں جاتا۔"

" کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو الٹے ہی جائے اور کیا کیا دیکھنا اور سُننا پڑے۔ کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تولو، پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اوپر اٹھتا چلا جائے۔ یہ بڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

بچپن سے شجو ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ پڑیں گے، ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی میں چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ میں ہی ڈور کٹ کے رہ گئی۔ کان تو شجو ماں کے بھی تھے۔ بڑے ٹھنڈے دلوں سنا کہ ربو کی شادی ہو رہی ہے۔ جس کا ابھی صرف سولہواں ہی تھا اور یہاں شجو ماں تو اٹھارواں بھی پھلانگنے کی سوچ رہی تھی۔

سر جھکائے جھکائے شجو ماں نے ربو کی کرتی میں پلکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اُس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکتے دیکھے نہیں، ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں۔ کچھ بھی اڑ جاتی۔

"اوئی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جاتا

" منہ زور جوانی ہے، سنبھالی نہیں جا رہی ہوگی۔"

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا۔ اب تو یہاں دن رات دھڑا دھڑ چولیاں سل رہی ہیں۔ اس پر بانکڑی ٹنک رہی ہے۔ کھڑے دوپٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے۔ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے مونڈھے ٹنک رہے ہیں اور ان سب کاموں میں شجو ماں آگے آگے ہے۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا ہم سن سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی۔ سارا کام شجو ماں کے سر تھا۔ گھرکیاں بھی سُن رہی ہے ـ جا بے جا پڑتال بھی پڑ رہی ہے۔

" اے ہے شجو ماں! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لہر یہ ٹیڑھی ٹانک دی۔"

" اے بی تمہیں آنکھیں نہیں ــ ؟ یہ بانکڑی میں نے تمہیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی ـــ۔"

سر سر دن گزرے جا رہے تھے۔ جیسے پروائی کے جھوکے۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا بھی دن آگیا۔ شجو ماں نے اپنے ہاتھوں دلہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ ادھر ربو دلہن ہی

بیٹھی تھی اور آج کئی دنوں بعد پھر شجو ماں کی آنکھیں برسے جارہی تھیں۔ کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بدنصیبی پر!۔

مہمان بیبیاں اُترتیں۔ جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں:۔

"اوئی بہن، ہم تو سدا سے سنتے آرہے تھے کہ دو منڈوے پڑیں گے۔ ہوا کیا۔؟"

"لے بہن یہی وہ تمہاری بٹی ہے جس کا ناطہ ٹوٹ گیا۔"

بڑی چچی چوٹی بنی اِدھر اُدھر منہ چھپاتیں۔ بہانوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں۔ اور ادھر شجو ماں پھرکی بنی سارا کام نبیٹر رہی تھی۔ ہر احساس سے عاری۔ ابھی جہیز کے کمرے میں ساڑیاں لائن سے جمارہی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے دانے کی خبر لینے جا پہنچی۔ ابھی پھلواری سے سہرے کے لئے پھول لے رہی ہے تو ابھی عود دان میں انگارے لئے ربو کے بال سکھانے لپک رہی ہے۔

شجو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی۔

"تاروں میں جلوہ دوست بابا، جلدی گھر کو جانے دو۔"

سلامی کی تھالی لئے وہ لپڑ جھپڑ چلی جارہی تھی۔ اک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سب ربو کی جان پر ٹوٹی پڑ رہی تھیں۔ جہاں آرا، جس کی شادی کو سال بھر ہوگیا تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی، ربو کو ٹھیل رہی تھی:۔

"اری سنتی ہے۔ جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو۔ اُدھر بنے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں۔"

ربو گٹھری تو تھی ہی، اور بھی سمٹ گئی۔

"اری یہ سب چالیں ہیں،" کوئی دوسری بولی، "ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولہے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے۔"

شجو ماں کے قدم سو سو من کے ہوگئے۔

"تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔"

"ارے یہ رات ایک ہی بار تو آتی ہے۔"

چھن چھن ..... چھن ..... چھن ..... تھالی گر گئی اور سلامی روپے پورے کے پورے، مع چکنی، الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر گئے۔

پھر ننھو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشلدکر وانے چلی گئی۔ مگر جب ننھو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اُٹھتا، چکر آتے تھے۔ اور ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ جماگیان بھی پوری نہ ہوئی تھی، شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہہ گھونگٹ کا پردہ اُٹھا اُٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی۔

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتہ میں چار دن باہر گزارتے چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آتے تو ننھو ماں ہی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ صفائی، جھاڑ جھنکل کرتی، مگر ربو صبح اُٹھتی تو وہی مچھروں کا رونا لے کر گال سہلاتی ہوئی، زیر لب مسکراتی ہوئی۔

"امی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹ پڑے ہیں۔"

سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی:—

"ہاں ننھو بی بی، سچ سچ یہ مچھر۔ توبہ ہے! اتنا بڑا مچھر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیس دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کمبخت جب ڈنک لگائے گا تو چہرے پر۔ گالوں پہ ہونٹوں پر، کیوں ہے نا ربو بی بی—؟"

ربو بی بی مسکرا کر اور بن کر شرماتی ہوئی اُسے مارنے کو لپکیں اور ننھو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور سیاہیاں تیر تیر گئیں۔

"ننھو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی—؟ کہیں کر ڈالو نا بہن۔"

"اللہ رکھے چھوٹی تو جھولا جھلانے کو ہو رہی ہے اور بڑی ابھی تک مٹھی ہی ہے۔"

آنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں اور بڑی بچی کا منہ نہ اُٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! اتنی شکر کیوں بھر دی حلوے میں—؟ دیکھتی نہیں ربو کو ابکائی پر ابکائی چلی آ رہی ہے۔"

"اجی بی بی، یہ ابکائی پھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔ ہماری بی بی اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے۔" سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

ننھو ماں اپنی بڑی آنکھوں میں حیرت لئے کبھی ربو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا

قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرتے قطع کرنے لگی۔

بڑھاپا

بلی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، مگر چلنے دونوں ہی میں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں۔ بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے، پنجوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں، آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

"باورچی خانے سے شجو ماں نکلی تو سلیمن بولی:۔

"بی بی! سر تو جھاڑ لیجیے، راکھ جم گئی ہے۔" شجو ماں کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا۔ چپکے سے یوں ہی شجو ماں نے آئینہ تھاما تو کئی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے ــــ گزرتے چلے گئے ــــ گزرتے چلے گئے اور اپنے نظر نہ آنے والے قدموں کی سفید سفید سی دھول چھوڑ گئے جو اور کوئی مناسب مقام نہ پاکر شجو ماں کے سر پر جم گئی۔

وقت گزرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور آرزوئیں بھی لئے جاتا ہے۔ جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شجو ماں کا دل کیسا نگر تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے، جہاں موقع ملتا وہ گھر کے چھجے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک کوے سے مخاطب ہوتی۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا

میرے بھاگوں کوئی مہمان ہو تو تو اڑ جا۔"

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی انھیں نہ رجھاتا۔ مزے سے بیٹھے کائیں کائیں کئے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اڑ کر بالم کا سندیسہ لاتا اور اس شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔

"ہا ــــ بچاری ــــ دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے ہوئے ــــ ہائے ــــ بچاری شہزادی ــــ" کہہ کر پھر سے کہانی

شروع کر دیتیں۔

کبھی کبھی شجو ماں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا ۔ نہیں ملے گا۔ دل میں ڈر لئے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔

"دادی بی! پھر اس شہزادی کے لئے شہر ممنوع کے دروازے کھلے ۔۔؟" مگر یہاں پہنچ کر وہ آس بھی دھواں بن کے اڑ جاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شجو ماں کے منہ کا تالا کبھی تو نہ کھل سکا۔

"ہا ۔ بیچاری شہزادی ۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا ۔ اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔"

شجو ماں نے گھبرا کر اپنا مرجھائے پھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی ۔" وہ چلا اٹھی ۔ "کوئی دوسری کہانی سناؤ ۔ دوسری کہانی سناؤ ۔ دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا ۔ مجھے معلوم ہے ۔ مجھے سب کچھ معلوم ہے دادی بی ۔" اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شجو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا، پھر اردو کی چار چھ کتابیں پڑھ ڈالیں ماموں، چچا سے پہلے تو رفت، رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستاں" "بوستان" بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونے والے دولہا میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دوسے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے۔ مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی الٹ جائے گا اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الف، بے کی تختی یاد کروانی شروع کر دی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں، وہ بھی پاس آ کر بیٹھنے لگیں۔ پھر ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ شجو ماں کی اچھی اچھی جماعت جڑ گئی۔ دس برس کے اندر کے لڑکے بھی آنے لگے اور یوں ادھر ادھر کے ملا کے بیس بچے ہو گئے اور شجو ماں باقاعدہ "آپا جی" بن گئیں۔ بڑے پیارے وہ ہر ایک کو بغیر گھر کے

جھڑ کے پڑھاتی۔ دل توسدا کا پھوڑا تھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہو گا وہ کسی کو کیا دکھ دے گا۔ ایسا بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا بی سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا۔ مگر ادھر صبح ہوئی نہیں کہ اکّا دکا دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہو جاتیں اور سب آ آ کے دیوان خانے میں بیٹھتے جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھروں کو بھاتے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شنوماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی۔

اتنی مصروفیت میں بھی شنوماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا۔ اور یوں جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو، آپ ہی آپ وہ چھجے پر جا کھڑی ہوتی اور ہولے ہولے پکارتی:۔

"کاگا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا"

کوے دھوم مچاتے :۔ کائیں، کائیں، کائیں — مگر وہیں بیٹھے رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو شنوماں کی آنکھیں بھی روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک طرف انتظار — کس کا انتظار ہے یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس روئے جاتی اور پکارے جاتی:۔

"تو — تو اڑ جا۔ کاگا رے کاگا —"

مگر کوؤں کو چھجے کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اڑنا تو دور رہا پر بھی نہ پھٹ پھٹاتے۔

"ہا — بیچاری شہزادی —! بڑی کرموں جلی تھی بیچاری۔ راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں۔ ارے جس کے سر پر باپ کا سایہ ہو اُسے کاہے کا ڈر —؟ یہ چھتر چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگہ مست تھے اُنھیں کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی۔"

"وہ کیوں دادی بی —؟" جماعت کی کوئی معصوم سی بچی پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں — "پھر ٹوکا دیا نہ مجھے —! ارے راجہ کی پسند کی رانی کہاں تھی؟ بس تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔ پھر دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے بچے ہیں بکے چلی جاتیں:۔

" اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے الٹے سیدھے دوچار بچے ہی کیسے ہو گئے،
سو ہو گئے، ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ جی اپنی رانی سے باقاعدہ ماں بہنوں جیسا برتاؤ رکھتے
ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ارے بازو تک نہ بیٹھتے، تو بچوں کچوں کا کیا سوال ۔۔۔! مزید ثبوت کو وہ
سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں:۔
" ارے پاس آ کے بیٹھیں گے ہی نہیں تو پھر اولاد کیسے پیدا ہو بھئی۔ ہاں تو پھر یہ دوری
اتنی بڑھی ۔۔۔ اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا
اتنا باپ کو کہاں تھا ۔۔۔؟ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی۔
" ہاں، تو پچھلی بار میں نے کہاں تک کہی تھی کہانی ۔۔۔؟
" ہاں، تو اللہ کا نام بڑا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت
کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آ نکلا۔"
شجو ماں ربو کی چوتھی بیٹی کے لئے ان کے موزے بن رہی تھی، اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں
اور ان کا گولہ اس کے ہاتھ سے چھٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔
کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے ۔۔۔ شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں ۔۔۔؟
" تو دربان نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی
خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوایا۔"
" اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا ۔۔۔؟" عائشہ بول اٹھی جواب دسویں میں تھی۔
اور اسے بار بار سینے پہ دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔
" اے تو بی بی اب شہزادی خود جوانی سمجھ ار تھی، بھلا اُسے پردے جھردے کی کیا ضرورت؟
ہاں تو بھئی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا، مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔
کیونکہ اس کے بدن پر بڑے بڑے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بڑی ہونق ہو گئی تھی۔
بال بھی بڑھ گئے تھے۔ شہزادہ تو کیا، ہاں ۔۔۔! صورت سے قیدی ضرور لگتا تھا۔"
دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے، مگر
شجو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔
" اب تم جانو شہزادی شہزادی سو عقلمندوں کی ایک عقلمند۔ اس نے سوچا:۔
اور نہیں ۔۔۔ ایسے نہیں۔ اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے۔ بس تو شہزادی نے

نوکروں کو حکم دیا کہ رات ہی رات کپڑا خرید لائیں ——— ہر ہر قسم کا کپڑا۔ اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس بھئی نوکر خریدی کے لئے دوڑے۔ پورے شہروں میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا۔ جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطورِ خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا ——— معلوم ہے کیسا بستر ——— ؟"

دادی بی کی کہانیوں میں دل بھر کے ناقابلِ یقین باتیں ہوتی تھیں۔ پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سنتے۔

"ہاں تو بستر کیسا تھا —— ؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا —— تیسرے پر چوتھا —— ایسے ستر گدے ایک پر ایک رکھوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ الٹا کر کے رکھ دیا۔"

"چنے کا دانہ وہ کیوں —— ؟" جمجو حیرت سے بولا۔

"ارے آگے سنو نا۔ بیچ بیچ میں منہ کیوں مارتے ہو رے —— ؟ تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے رکھ دیا۔ رات ہوئی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادی نے منہ ہاتھ دھویا، نہ کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ پوچھا:-

"کیوں جی، آپ کی رات کیسے گزری۔"

شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔

"جی رات تو آپ کی بدولت اچھی ہی گزری، —— مگر ....." ... اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"کیا —— ؟ شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔"

شہزادی نے اس کی قمیص الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ نیلی ہو رہی تھی تب شہزادی کو یقین آگیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے۔ کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہو سکتے ہیں کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ بیچ بچ کا ہی شہزادہ ہے اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے کی محبت پیدا ہو گئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور

شہزادہ بھی خاصی بڑی عمر کا تھا۔ تو تم جانو دھان کا پودا گھٹنے گھٹنے پانی ہی میں پروان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اٹھا رکھا تھا کہ چوڑیاں، زیور اور رنگ برنگی کپڑے دپڑے پہننا سب ترک کر دیا تھا۔ گویا بوگ اٹھائی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی، جھکا جھول کپڑے پہنے، جھم چماتی، کھنکھناتی چوڑیاں پہنیں، جھومر لگایا۔ شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا اور اس وقت تو بڑا مزا آیا جب ......"

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے:۔

"اجی بھابی جان سنتی ہو! غیر کریں تو پھر غیر ہیں۔ یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں ....." ایکدم وہ رک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں ۔۔ ؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا۔

دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شجو ماں انھیں کی طرف دیکھ رہی تھی، آواز نیچی کر کے بولے:۔

"کہتے ہیں ربو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے۔"

اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش رہ گئے۔

"اور وہ تمہاری میری بہن ۔۔" وہ پھر بول اٹھے۔ "کمینی کدھر کی، کہتی تھی شجو ماں کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں۔ ؟ اور کھانا تو برائے نام کھاتی ہے۔"

"میاں ۔۔ !" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تمہیں کہو میری شجو ماں ایسی ویسی لڑکی ہے ۔۔ !"

"ارے نہیں جی بھابی جان ۔۔ ! میں یہ کب کہہ رہا ہوں ۔۔ ؟ میں تو تمہیں ذرا سنانا چاہ رہا تھا کہ تمہارے والے ایسے گنوں ہیں۔"

"میاں ۔۔ !" بڑی چچی پھر بڑے سہمے ہوئے لہجے میں بولیں، جس میں گھگھیاہٹ بھی شامل تھی ۔۔ "بلا سے عمر ڈھل گئی۔ آج بھی کوئی ملے تو ہاتھ پیلے کر دیں اس کے۔ تمہاری نظر میں کوئی نہیں ۔۔ ؟"

"بھائی جان، بھلے کو شجو ماں کوئی حرامی پلہ ہی جن ڈالتی تو اتنی خرابی نہ ہوتی، مگر منگنی ہوئی مٹی کی بات ٹوٹ کر تو ۔۔ اونہوں، یہ تو بڑی ناممکن سی بات ہے۔"

جلتے تیل کی بوندیں سی شجو ماں کے کانوں میں گر رہی تھیں۔

"اوہ خدا ـــــ یہ جوانی! کیا میں اب بھی جوان ہی دکھائی دیتی ہوں کہ لوگ یوں نام دھر سکیں اس نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ ڈھلتا سورج زبان حال سے کہہ رہا تھا۔" بس شام ابھی ہوا چاہتی ہے۔" پھر یہ دنیا ـــــ اور دنیا والے ـــ!

اماں نے ایک بار پھوپی بی کے رنڈاپا پڑھایا تھا۔ پھوپھا میاں راتوں رات چٹ پٹ ہو گئے تھے۔ اماں بی نے پھوپی بی کی کچ کچاتی ہری ہری چوڑیاں مار مار کے پھوڑی تھیں۔ گلابی ریشم کی پھولدار ساڑی نوچ کر پوگی کی موٹی سی سفید چادر اوڑھا دی تھی۔ کالی کالی پوت کا پھا کھینچ کر گلا سونا سونا کر دیا تھا اور کلیاں کروا کروا کے مسی کی دھڑی چڑھوائی تھی۔

"میں بھی رنڈاپا پڑھا لوں گی ـــ"

"مگر وہ کہاں ہے، جس کے نام سے مجھے رنڈاپا اور رنڈاپے کی ویرانی مل رہی ہے۔؟"

اس نے بھرے دل سے سوچا۔ پھر پھواڑے کے آنگن میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی مباف تھی، اسے پھاڑ پھینکا۔ پھر کمرے میں آ کر زعفرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیرالدین کا بھانجا بڑا اکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں بڑا بودا۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا تھا۔ مگر اٹھ اٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں باجری کے بھٹوں کی طرح اسے دنا دن ٹھوکتے۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نویں برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ شجو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی کہ دو کلاسیں ہو رہی ہیں۔ ماں نے بھائی سے کہا:ـــ

"بٹھا دو لے جا کے شاہجہاں بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائے گا راستے سے۔"

نصیر میاں کے دل کو بھی بھا گئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنا کے۔ بغل میں بستہ دبا کے شجو ماں کے گھر آئے۔ یہ دیوان خانے اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ شجو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا، اور دستک دینے والے کو کہا:ـــ

"اندر آ جاؤ ـــ"

آگے آگے ردف میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔ ایک دم شجو ماں سٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل

سر پہ لرز رہا تھا اور وہ سمٹی سمٹائی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

"یہ...... ب...... ب...... بچہ پڑھتا ہی نہیں...... ب...... بالکل......

وہ ہے" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر گر رہی تھی۔

"جی...... م...... م...... میں پڑھاؤں گی۔ یہاں تو بھی ڈھیٹ آتے ہیں" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں — ذرا دھیان سے پڑھا دیجئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے" اور وہ سلام کرکے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے!"

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے!!

"آپ کی بہت تعریف سُنی ہے!!!

ننھو ماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے رہ گئی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے۔؟"

"ہاں آپا جی — آپ بہت — بہوت اچھی ہیں" سب آگے پیچھے بول اُٹھے۔

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے، کچھ بھی تھے سکتے، مگر جوانی میں ان کا بڑا زور رہا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت من کو نہ بھاتی۔ یہی وجہ تھی کہ چالیس کے اوپر ہونے آئے مگر اب تک بھی آدم بنے کسی گم نام حوا کو کھوجتے رہتے۔ ہزاروں ہی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی۔ مگر دل پر کوئی نہ چڑھی۔ بڑی بی جی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔ بڑے پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پر چاہو تو تکیہ بنا کر لو۔ کٹے والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیزداری تھی مگر آنا جانا سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ جا کر پڑھ آئے تھے۔ اُس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے۔ اور ایک فوٹو بھی تھا۔ کالا کالا جبہ سا پہنے، سر پہ ترچھی سی ٹوپی لگائے۔ پورے خاندان والوں میں وہ فوٹو گھومتا پھرا، اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی، مگر بیچ میں یہ کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے "آتے آتے اللہ میاں اپنے ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا لے آئے تھے۔ جو ان کے کسی انگریز دوست

نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جابرسے تے کر دور سے دیکھو تو شیر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان پر دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے دو دو حج کئے وہ الگ۔ چار پانچ روزے تو کبھی نہیں گئے تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے ساتھ کتے بھی اٹھا لائے ہیں تو پہلے پیار دلار سے سمجھایا کہ "دیکھو میاں، جس گھر میں کتے ہوں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے۔ فضول ناپاک ہوتی ہے۔ بڑا نحس جانور ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔" مگر انور میاں نے ایک نہ سنی۔ بس دادا حضرت کو تاؤ آگیا۔ انور میاں کا گھر میں آنا جانا ہی بند ہوگیا۔ اب یہ بات اتنے غصے۔ پتے کی بھی نہ تھی، مگر غصہ میں تو ایک فرشتہ بھی شیطان بن جاتا ہے۔ دادا حضرت نے جڑ ہی اکھاڑ پھینکی۔ اور ان کو گویا ذات باہر کر دیا۔ انور میاں بھی دھن کے، زیادہ صحیح لفظوں میں اپنی ضد کے، ایسے پکے تھے کہ ذرا بھی تو اثر نہ لیا اور اوپر سے غیر کف کی بیگم بیاہ لائے۔

انور میاں کا جب بھی ذکر نکلتا تو بڑے گھر والے طعنے سے۔ "اجی وہی کتے والے سید انور" کہہ کر یاد دلاتے۔ اور پھر ایسا ہوا کہ مٹتے مٹتے انور میاں کا نام ہی "کتے والے سید میاں" پڑ گیا۔ گو یہ ضرور تھا کہ کتے تو پالے، مگر کیا ہے جو اپنے معمولات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔ دیوان خانے کے باہر ہی ایک چبوترہ سا بنا دیا گیا تھا، جہاں دن بھر یہ دونوں کتا کتیا بیٹھے آنے جانے والوں کی پریڈ لیا کرتے تھے۔ یوں تو علی گڑھ سے انگریزی پڑھ آئے تھے۔ ڈھیر ساری کتابیں چاٹ ڈالی تھیں، مگر تھے وہی سیدھے سیدھے مسلمان۔ اور خود ہی تو بولتے۔۔

"او میاں یہ علم ہمیں یہ تھوڑی ہی سکھاتا ہے کہ اپنا دین اور مذہب چھوڑ کر عیسائی بن جائیں۔" یوں پہننے کو کوٹ پتلون بھی کبھی کبھار پہن لیتے، مگر مرتے مر گئے، وضع داری نہ چھوڑی۔ وہی شرعی پاجامہ، کھلی آستینوں کا کرتا چار کلی والا، سر پر رام پوری کالی ٹوپی اور ہاتھ میں نانا باوا کی دی ہوئی چھڑی۔ صبح کی نماز بھی شاذ ہی قضا ہوتی۔ ہاں عشاء کی نماز میں اکثر ٹھینگا مار دیتے بولتے:۔ "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا میں۔ بڑی گنگی آجاتی ہے آنکھوں میں۔"

انہی کی اولاد یہ نصیر میاں تھے۔ جیسا بیج ویسا پودا۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا۔ عمر کہاں کی کہاں پہونچ رہی تھی مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے۔

باپ بڑبڑاتے:۔

ارے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ کر چھوڑ دے۔"

ہنس کر رہ جاتے۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہوگئے تھے، یہ ابھی تک پتنگیں اُڑاتے پھرتے تھے۔ کہتے تھے:۔

"جب تک کنوارے ہو، بچّے ہو۔۔! شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا۔" اپنے جانے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے!

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلوا بھیجا:۔

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا۔" رؤف میاں نے گردن اُٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھولنے لگیں، حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نصیر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے۔

"واہ بھئی واہ ۔۔ یہ کوئی حساب ہوا۔ سولہ دونی بتیس ہوتے ہیں آپ چھتیس بتا رہی ہیں۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی۔ مسکراہٹوں پر سے راشن اُٹھ گیا تھا۔ جی کھول کر مسکراتی، قہقہے لگاتی۔ گر حیرت کی بات یہ تھی، شجو ماں سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پکارنے کے باوجود ایک بھی کوا تو نہ اُڑ اتھا!

اور پھر بڑی انہونی سے بات یہ بھی ہوئی کہ شجو ماں نے بقرعید پر اپنی پسند سے ہری بانگیں پہنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے گوٹ چڑھوائے، اور پیسے ادا کر کے منہارن کو جب سلام کیا تو اُس نے بھی دل بھر کر دعائیں دیں۔

"اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے، جی کے ارمان نکالیں۔ تمہارا بھی بھلا ہوئے،" اور شجو ماں جو کسی کے بھی منہ سے یہ دعائیں سُن سُن کر سفید پڑ پڑ جاتی تھی، شرم سے تپ کر دودھ ابلی گاجر کی طرح لال لال ہوگئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شجو ماں، جو پورے خاندان میں گھر گھُنی مشہور تھی، ٹھیل ٹھیل کر ماں سے کہتی:۔

"اماں ۔ آخر انور چچا نے کتے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا؟ مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا! اب کرنے والے تو مر کھپ کر مٹی میں مل گئے۔ فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ۔ آپ ان کے گھر آتی جاتیں کیوں نہیں ۔۔؟"

نصیر میاں جو بھانجے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔ کبھی کھانا کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شجو ماں، جو ساری دنیا سے منہ موڑے راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنستی گاتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نصیر میاں کو کھانے پر رول لیا اور خود بھی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آ گیا:۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی ۔۔۔؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے۔" نصیر میاں مسکرا کر بولے:۔ "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کر سکتا ہے۔؟ ننھو ماں شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اٹھا کر بولی:۔

"آپ کوشش کیجئے، میں دعا کروں گی آپ کے لئے۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کتے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نصیر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جو اَن بیاہی ہے۔ کے یہاں جا جا کے بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونے والی ہے۔

لاکھ بات بھی ہونے والی تھی، مگر تھی تو کنواری ہی ننھو ماں۔ ماں نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر ملے نہیں۔ ننھو ماں ایسی ویسی عمر اور چال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ بولتیں بھی کیا! پھوپھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں:۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں، صاف لگا ہی دیا لگانے والوں نے کہ الو میاں سے ہنستی ہیں۔ الو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے۔"

ننھو ماں نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں بھی مسکرا مسکرا بات کرتے۔ تعلیم یافتہ تھے، ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بچارے، ورنہ ہزار بار تو کفر توڑ تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی ایسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا، مگر انہوں نے تو کبھی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان بھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے:۔

"وہاں میز پر رکھ دیجیئے۔ ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں۔"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شجو ماں کے دل میں دگنی ہوگئی تھی۔

شجو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں۔ اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا۔ پھر نظر آتا کہ پیچھے پر کھڑی کوؤں کے پیروں میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوے اپنے کالے پر پھڑپھڑاتے۔ کائیں کائیں کرتے اڑے چلے جا رہے ہیں۔ پیروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شجو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔

شہر ممنوع

دادی بی نے اِدھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سُنائی تھی۔ آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔

"ہا — بیچاری شہزادی۔ تھی نانصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا، پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی۔ اور آخر کو وہ دغا دے گیا۔ پیاروں پیٹا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر:—

"چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کروں گی۔ اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم — !"

آج اسحاق چچا کلائیمکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے:—

"کیا زوردار شادی کی بھئی۔ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"

"کس کی شادی کا ذکر ہے میاں —؟" بڑی چچی جھپکیاں لیتی پڑی تھیں، کروٹ بدل کر بولیں۔

"ارے آپ کو نہیں معلوم! — نصیر میاں کی شادی سے تو آرہا ہوں۔"

"ہائیں !" بڑی چچی ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھیں۔ "نصیر میاں کی شادی؟ ہمیں تو رقعے بھی نہیں آئے مگر ...."

اسحاق میاں نے بس کی زوردار گالی دی۔ وہ کتے کے بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نہ۔ وہ تو ہم سے کاٹے کھاتا ہے۔ مجھے تو جمیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے۔"

"یہ کس کی بیٹی ـ؟" بڑی چچی نے ڈوبتے لہجے میں پوچھا۔

"شیر کف کی ہے۔ نواب جانی کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجھٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام ـ !"

"ہاں تو بھئی، وہ کہانی ختم ہوئی۔ اب یہ دوسری سنو ـ ایک تھا ...."

"دادی بی بی !" آنسو بھری آنکھیں لئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شجو ماں پوری طاقت سے چلا اُٹھی، "آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں۔"

شجو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدے کی آڑ میں کر لئے۔

"اوئی ـ میں نے کس کی زندگی تباہ کی ـ؟ کہانی جیسی کہانی تھی، شادی ـ اے لو اور سنو۔" اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شجو ماں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ ہی آپ ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پر جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجو ماں نے بغدادی قاعدہ اُٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی:ـ

"پڑھو میرے بچو ـ !

الف سے انار

بے سے بکری

تے سے تلوار ـ"

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

کانچ کا دل

رانی دلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا زچگی جاپہ تو تھا نہیں جو یوں سسیابی پھول کی طرح کھلی پڑتیں۔ مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی نا کہ اوپر تلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے تو اماں بیگم کو پوتے کی دادی نہ بنایا۔ لے دے کے انگنائی، صحنائی اور گھر بھرے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں پھرا کرتیں۔ اماں تو رہ رہ کر سوچتیں: ہے ہے، جس بہو کو دیکھو ٹپاٹپ بیروں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہوگا؟ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا؟" مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں، لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ چھوڑ پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جہاں کسی نئی نویلی پر اس کی نظر پڑی اُس نے جھٹ وہیں بتا دیا:

"میں کہوں بہو پوت جنے گی۔"

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سنا دی، تو کیا مجال جو بیٹا سر اٹھا کر چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات پہچانتی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔

میاں کو بٹیا رانی کا وہ ارمان تھا کہ نچلے والے بیٹے کو سدا رنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور چھن چھن کرتی جھانجھیں بھی پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں ٹوکتی بھی تھیں کہ اس کی تو عقل اُلٹ گئی ہے۔ بچپنے ہی سے اُسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے، بھلا اس پہ کیا اثر پڑے گا؟ ساری عمر ماں کے کولہے سے لگا ہانڈیاں دھوتا اور روٹیاں بیلتا رہے گا۔ بھو ان کے طعنے خوب سمجھتی تھی، مگر ممتا کے مارے جی کو ننھی منی سی کلی کی لگن تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی؟ مگر اگلے برس جب بھو کو حمل ٹھہرا اور وہ سہم سہم کر قدم اُٹھانے لگی اور اہلی گہلی پھر پھر کر کچے پکے پر للچانے لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا:-

"میں کہوں اب ننھے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اُتار لے۔"

بھو نے چکرا کر ساس کو دیکھا تو ساس ہنسی اور بولی:- "اور کیا۔ یہ دیکھ، رات کو نیند میں، میں نے تیرے گلے سے گلسرا اتاری اور تو کسمسائی تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر تیرا پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بیٹا پیٹ میں رہے، تو پیٹ اونچا رہتا ہے۔ ماں باپ کی ناک اونچا کرنے والا دنیا میں آنے والا ہوتا ہے نا، اس لئے۔"

"اچھا؟" بھو ذرا خفگی اور ذرا شرارت سے بولی، "تو اس کا مطلب تو یہ ہوا ناکہ بیٹی ماں باپ کی ناک کٹاتی آتی ہے۔ کٹی ناک والی آتی ہے تو پیٹ بھی چپٹا چپٹا ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے نا تیرا؟"

ساس تو اپنے چھ پوتوں کی دادی کہلائے جانے پر ناز اں رہتی تھی، ہنس کر، بُرا منائے بغیر بولی:-

"اور بتا تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے؟ آئی بھی ہے تو مہمان کے سمان۔ جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد ہی تو دے کر گئی ہے نا بول جھوٹ کہتی ہوں؟"

بھو کچھ نہ بول پائی۔ مگر جب جاپے کے دن قریب آئے تو اس کو ساس کی رہ رہ کر بات یاد آتی رہی اور جب کچے پکے دردوں سے گزر کر اس نے سکون کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس

گر محلے والیوں سے کہہ رہی تھی :۔

" اے میں کہوں چوڑی والی کو بلا دو ری، گھر میں سہاگن براجی ہے۔"

مگر رانی دلہن کے حق میں تو دھنیا دائی کی پیش گوئی بھی اُلٹی ہی پڑی۔ پیٹ دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتا تھا اور جنم دیا بیٹی کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار یہی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں کی فوج تیار ہو رہی تھی۔ جٹھانیاں، دیورانیاں سبھی لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹوں کا کال تھا۔ ہاتھ کی بات تھی ہی نہیں۔ یاسین دُوُد پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی دُعائیں مانگیں بھی، مگر اُجڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دلہن پورے دنوں سے تھی اور ساس کا دل پھر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ کے ابھار نے اُنھیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کہ پوتا ہو گا ہی۔ مگر رانی کے دل پر تو ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انھیں چیرتی تو اُجالا نہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ وہی ایک تو بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے سکے ایک ہی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر چلے آ رہے تھے۔ نہ ساس نے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی ہی نے سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جب ایک رات سوتے سوتے رانی جاگی تو گھبرا گھبرا کر یہی کہنے لگی:۔

" ہائے اماں یہ کیسا درد ہے؟ بیٹھے سے اُٹھ اُٹھ کر لہریں سارے جسم کو پکڑے لے رہی ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا۔"

" ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا۔" اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سُنی اور وہ بستر پر کل کے کھلونے کی طرح، پھرتی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں اجوائن، عود اور دھویں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بو تھی اور رانی کی ڈوبتی اُبھرتی سانسوں کی لہریں۔ دائی نے اندھیرے سے اُٹھا کر ہاتھوں کو اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخ حلق سے یوں پھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ گیا۔

" اے دُلہن میں کہوں بیٹا ہے۔ پورا کا پورا جیتا جاگتا بیٹا۔"

اور پھر ہیاں، یا ہاں، ہاؤں ہاں، کی خوشگوار آواز۔ سچ مچ بیٹے کی آواز۔ "میں آگیا ہوں اُجالے لے کر۔ ناک اونچی کرنے والا، خاندان کا نام چلانے والا۔"

دائی پھرتائی سے باہر نکلی اور چیختی ہوئی اماں کے پاس پہنچی :-

" اری بی بی، سنا تم نے ؟ بیٹا ہے بیٹا ! چاندی کے کنگن پہنوں گی، — ہاں "

" اری دھیرے بول نامراد۔ ساری عمر بچے جناتے گزری، اتنا نہیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئیں ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سُنے گی تو جی کیا بولے گا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے "

اماں دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ رانی شطرنجی پر کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ زمیں پر۔ دوسرا کولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کر سے پھر لڑکی ہوئی ہے " شرمندگی اور غم کے مارے اُس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اسے میں پہلے تو یہ کہوں گی کہ لڑکی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رونے پر آئے گی تو بتاؤں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابل عزّت اور قابل احترام شخصیت بن چکی ہے۔ سنا رانی تم نے ؟ سُنا ! "

ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں، اور اب ایک پوتے کی دادی، دھیرے سے بہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا بیٹے کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی، سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکریہ پیش کرنے چل دے !

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپوش ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سُن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ ایک ایک نے اُکر ہلایا، پکارا، بچھتاوے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ ہچکی ٹوٹی۔ جس جگر رانی نے صبح کا بھرپور اجالا بکھیر دیا تھا اور اب وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں ڈھائیں ڈھائیں بھر رہی تھیں اور بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا۔

" ہائیں۔ ھیاں۔ ھیاں۔ می ھیاں۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔ تم کہاں چلی گئیں ؟ تم نے میرے لئے دُعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور دُعاؤں کا سہارا لیا، اور اب جب میں تم تک چل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں کس کے پاس رہوں گا ؟ کون مجھے پیٹھا رس

بلائے گا؟ اب میں کس کے پاس رہوں گا۔؟ سب مجھ سے دور دور بھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ بھی نہیں ٹپکایا ہے امی۔ میں روتا ہوا آیا تھا کہ ہنسیوں اور مسکراہٹوں کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، اِدھر اُدھر، آس پاس آنسو ہی آنسو ہیں۔ یہ چیخیں ہیں، آہیں ہیں۔ بے نور آنکھیں ہیں اور تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں، میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو کھا لیا ہے۔ تائیاں، چچیاں مجھ سے دور دور بھاگ رہی ہیں۔ ایک دو دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دے گا؟ کون مجھے پیار سے گلے لگائے گا امی! دادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ ابو مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ پھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ ہیاں ــ ہیاں ــ می ہیاؤں،،

رانی مسکرائی۔ دو ہاتھ، سوکھے مارے مگر محبت کی آگ سے تپتے ہوئے ہاتھ، جن میں خون کی رمق بھی نہ تھی۔ جن میں چوڑیوں کی چھنک نہ تھی، پالنے کی طرف بڑھے اور انھوں نے ایک ننھے منے گیلے گیلے وجود کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

" مجھے تم سے یہی امید تھی منجھلی پھوپھی "۔ رانی جیسے سرگوشی میں بولی۔

پھوپھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کیسی سرگوشی تھی؟ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر گزرا تھا؟ انھوں نے کانپ کر بچے کو گلے سے لگا لیا۔

" میرے بچے! میرے بچّے! میری جان! ،، ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

منجھلی پھوپھی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں بیاہ کر آئی تھیں، تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجوں کے بیچ وہ گڑیا سی بہن نظر آیا کرتیں۔ نہ سمجھنے والے انھیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے۔ اماں تو پتہ نہیں کون ساخون، کون سا اثر لائی تھیں کہ چھ سات بیٹیوں کے ساتھ ساتھ چار بیٹوں کی بھی ماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل در نسل یہی ہو رہا تھا۔ کہ ایک آدھ لڑکا ہو گیا جس سے خاندان چلتا رہا۔ جب اماں کی ساس مریں اُس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہی تھیں۔ ساس نے اسے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ بھی سدا بھائی بھاوج

ہی میں گھلی مِلی رہیں۔ دن بیتے اور اماں نے بیٹے بیٹیوں کے گھر بسانے شروع کئے تو
تو منجھلی کو بھی ماں بن کر بیاہا۔ مگر رفو کو بھاوج کا ساتھ کچھ ایسا بھایا تھا کہ دور رہ ہی نہ
سکی۔ جاڑوں کی ایک رات اس کے میاں نہا کر پنکھے کی ہوا میں سوے اور صبح اُٹھے تو سارا
جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں رفو کیا ۔ کیا ہو گئی۔ بھاوج نے لال کپڑوں سے
وداع کیا تھا اور بھائی جب لائے ہیں تو سرے پاؤں تک سفید، برف کی کلی بنی ہوئی تھی۔
جی کھول ہنسنا رفو کو راس نہ آیا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی
شاخ کی طرح جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تاروں بھرا آسمان سر پہ جگمگاتا۔ اور وہ دل میں
اندھیرے لئے سسکتی رہی، جاڑے گرمی، برساتیں، خزاں، بہار، سب اس کے لئے ایک
جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ بھتیجوں، بھتیجوں کے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کو
جیتی گئی۔ کوئی اسے گھڑک دیتا، کوئی دو بول سُنا دیتا۔ کوئی قصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور
وہ خاموش اور معصوم آنکھوں سے دیکھ کر گویا اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیتی۔ میاں
اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر مرے تھے، سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنا ایک
گھر بار کر سکتی اور مزے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں میں جیتی آئی تھی، وہ ان سے ہٹ
کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو بھری بہار میں اُجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے
دیکھنے اور نہارنے والا بیٹھا تھا؟ پہنتی، اوڑھتی بھی تو کس کے لئے؟ سارا پیسہ انہی بچوں پر
اُٹھا دیا کرتی۔ وہ مشین کی طرح ہر کام انجام دیا کرتی لیکن ۔ لیکن اتنے دنوں بعد اب
پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ننھا شمیم ابھی دو ہی چار دنوں کا تو تھا۔ بے چارے نے ماں کا دودھ چکھا بھی نہ
تھا۔ اس کی زندگی کا کیا بنے گا؟ ۔ کیا یہ پھول کمہلا کر رہ جائے گا؟ رفو نے بے بسی سے
ان ماؤں کی طرف دیکھا، جن کی چھاتیاں دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس
ننھی سی جان کی زندگی کا سامان مہیا کر سکتے تھے۔ مگر اپنے خون سے کسی دوسرے کے
لگائے پودے کو سینچنے کا ظرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے؟

منجھلی پھوپھی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ ممتا کے سوتے تو مدت ہوئی وہاں
خشک ہو چکے تھے۔ پھر ۔ پھر اُنھوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی جس کا کوئی نہیں ہوتا

اس کا خدا ہوتا ہے۔ انھوں نے روئی کی بتی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو بھگو کر ننھے کے منہ میں ٹپکانے لگیں۔

زندگی کا یہ پہلا دور تھا، جب وہ خوشی خوشی جینا سیکھ رہی تھیں۔ بچپن تو جیسا بیتا سو بیتا، بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ بیاہ کر میکے سے سسرال آئیں تو چند ہی دنوں میں ساری خوشیاں جل کر خاک ہو گئیں۔ نہ وہ کسی کے لئے جی سکیں۔ نہ کوئی ان کے لئے زندگی کا سامان کر سکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پر بہار اور رنگین راہ پر چل پڑی تھی۔ وہ جیتی تھیں ننھے کے لئے، مسکراتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور پھر ننھا تو سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کئی دن گزرنے پر اماں جی ہوش میں آئیں تو دیکھا کہ شمو نند کی گود میں رہ رہ کر ہمکتا تھا اور کوئی اُسے لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیتا۔ تینوں پوتیاں تو اماں ہی کی نظرِ شفقت کی مرہونِ منت تھیں، پوتا تو پورا کا پورا ہی نند کا تھا۔ ایک دن اماں نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی :-

"اب رنو بیگم جانیں اور شمیم میاں۔ میں نے تو ان کی گود میں ڈال دیا۔ اب وہ ان کی ماں ہیں اور وہی ان کے بیٹے۔"

رنو بیگم کا دل جیسے اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں آنکھوں سے نکل پلکوں پر کپکپانے لگا۔ "میرا بیٹا! میرا بچہ —!"

شمیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ کوئی انھیں پوچھتا نہ پوچھتا، ماں اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے بھی نہ ہوئے ہوں گے، ضد کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کی پے میں پڑ جاتے تو مچل مچل کر زمین آسمان سر پر اٹھا لیتے۔ بڑے ابا ایک بار کہیں شیشے کا ایک گلدان لائے تھے۔ قیمتی اتنا نہ تھا جتنا خوبصورت تھا۔ اور پھر جب چیز پرانی ہو جائے اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لائی ہوئی ہو تو وہاں قیمت کا سوال رہ بھی نہیں جاتا، وہ ایک قابلِ احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک دن کہیں شمو میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا، ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے۔ کھڑے تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل بھی لیتے تھے۔ گلدان سنگھار میز کے پرلی طرف رکھا ہوا تھا۔ بھدبھداتے ہوئے گئے اور گلدان اٹھا لیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے مارتے کہ تائی بی

نے دیکھ لیا اور چلا کر دوڑیں :۔

"ہے ہے ابا میاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے"

ہاتھ سے گلدان چھینا تھا کہ شمو نے چیخ چیخ کر حالت تباہ کرلی۔ لاکھ کھلونے دیئے جارہے ہیں، لالچ دیا جارہا ہے، مگر بہلائے نہیں بہلتے۔ منجھلی پھوپھی کہیں باورچی خانے میں ان کے دودھ دلیے کی برابری کر رہی تھیں۔ وہاں سے چیخ چاخ سن کر لپکی آئیں۔

"ہوا کیا؟" وہ تیزی سے بولیں، "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو جیسے سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"

تائی تنک کر بولیں :۔ "بن ماں کا ہے تو جو چاہے کرلینے دیں؟ ابھی گلدان توڑ دیا ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں"

پھوپھی کو دیکھ شمو اور زور زور سے رونے لگا۔ رفو بیگم نے آگے بڑھ کر گلدان اس کے ہاتھ میں تھما دیا، اور دوسرے ہی لمحے خوشی خوشی شمو نے تڑسے زمین پر دے مارا۔ معصوم مسرت کا سارا راز اسی تڑ میں پوشیدہ تھا۔

سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سرے او نچی جا رہی ہیں۔ ایسے تو بن ماں کے بچے کو ڈیڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد ایسے ہی پوری کی جاتی ہے!؟

دادی اماں کے کانوں تک شکایت جانے سے پہلے ہی منجھلی پھوا نے ایک نہ دو چار گلدان منگوا کر میز پر سجوا دیئے۔

یہ پہلا وقت تھا جب منجھلی پھوپھی کا دل پوری طرح ایک ماں کی طرح تڑپا تھا اور وہ اپنے جگر گوشے کے لئے سب سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی تھیں۔ یہ ایک ننھی، بالکل ہی ننھی سی بات تھی، مگر جیسے جیسے شمو بڑا ہوتا جارہا تھا، پھوپھی کی محبت دیوانگی اختیار کرتی جارہی تھی ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ تھا، محبت کرنے، چاہنے اور چاہے جانے کی اس لذت سے وہ یکسو محروم تھیں جو کبھی تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔

شمو اپنی بہنوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی جان، نہ کسی بات کی سمجھ نہ اپنے پرائے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں۔ چھپا چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا۔ ٹھولا ٹھالی بھی چل رہی تھی، کسی نے سر پر ایک دھول جمائی۔ اس نے ادھر ادھر سر گھما کر دیکھا اور پھر

بے بسی سے پکارا :۔

"امی"

رفو پھوا دالان میں کرسی پر سویٹر بنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود نکھر اگیا۔ امی۔امی۔امی۔

آج ایک ننھے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالا تھا، اور وہ لفظ تھا امی! اور امی کون تھی؟ سویٹر پھینک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رک کر بے تابی سے ننھو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

"میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچے! میرے بیٹے!" سینے سے اُبال سا اُٹھ رہا تھا۔ وہ پھپھک پھپھک کر روئے جاتی تھیں اور ننھو کو اپنے سینے سے بھینچے جاتی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے اُنھیں فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں۔ مگر اب اُن کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھی!

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذّت سے گزر کر اب وہ اس دور سے گزر رہی تھیں، جب کہ ان کی اولاد نے اُنھیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے، کانچ کا دل تھا، جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو جاتا تھا۔

رفو پھوپھی سے اب نہ ممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود سے، اپنے دل سے، اپنی آنکھوں سے اپنے راج دلارے کو اوجھل کرتیں۔ ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیز کی شادی کا بلاوا آیا۔ انکار کرتیں تو کیسے؟ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور ننھو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟ وہ تو انھیں امی کہتا تھا! اگر کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکال دیتا، تو چار لوگوں میں کیا عزّت رہ جاتی؟ اکیلا پن کیسے برداشت کرتیں؟ مگر ٹال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ گئی تھیں کہ رات ہونے سے پہلے ہی آ جاؤں گی، مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر تھی کہ تارے کھل گئے، چاند چمک اٹھا۔ ان کے اپنے دل میں بھی

چاند کا عکس تھا اور آنکھوں میں تارے۔ لاکھ ناں۔ ناں کی مگر رکنا ہی پڑا۔

صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں لگی تھی جو اُٹھنے نہ اُٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی تھیں۔ اسی جاگل نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال دیئے تھے، نیند کا نشہ الگ، جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں رہیں سو الگ ان کی سوئی سوئی جوانی جیسے آج گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی تھی۔ انگ انگ چٹخا پڑ رہا تھا۔ اور جس وقت وہ چارپائی سے اُتری ہیں اور زمین پر پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو خود انہیں یہ محسوس ہوا، جیسے چٹ سے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ بول جائے گی۔

بلگجی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قاتل آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتی، نوکر کو کھوجتی پھرتی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے پہلے تو یوں ہی لاپرواہی سے دیکھا، مگر ایک نگاہ جو پڑ گئی تھی، جیسے چپک کر رہ گئی۔ یہ رفو بھابی تھیں! رفو بیگم؟ رفو دلہن؟ رفو بیوہ؟ کتنے برس بیوگی کو ہو رہے تھے؟ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں سے یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ بہو کو پھر سے بیاہ لائیں۔ کیا ہوا اشرف اگر مرنے والے کا چچازاد بھائی تھا؟ تھا تو ہر لحاظ سے قابل! اتنے دن گزر گئے مگر اشرف نے بھی کہیں شادی نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو، مگر سوچتا ضرور تھا کہ اگر یہ چراغ اسی کی تاریک کٹیا میں جل اُٹھتا تو؟

ایک قدم۔ دوسرا قدم۔ تیسرا قدم۔ رفو عمر کے اس دور میں تھی، جب پھل کچے پن کی حدوں سے گزر کر پکنے لگتا ہے۔ گدرایا، گدرایا سا، رس بھرا، اور پہلے سے کہیں میٹھا۔ آنکھیں اُف یہ آنکھیں! شاعر ایسی ہی قاتل آنکھوں پر شعر کہتے ہوں گے۔ آنگن میں پلنگ ہی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا، کوئی کروٹ لے رہا تھا۔ کوئی کسمسا رہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا، لپک کر آگے بڑھا اور بے چینی سے یوں بولا۔ جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو بے چین تھا:۔

"رفو، اکیلی کب تک زندگی بسر کرو گی؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے اور تمہارے ساتھ تو کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔"

رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھرتھرا اُٹھی۔ بیوگی کے اتنے سارے بھیانک

سال ___ روتے گاتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لمبے اور اُکتا دینے والے سال ۔ اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں گزر گئے ___ سہارا ؟

قبول کروں ؟ ساتھی بِنا زندگی کٹتی بھی تو نہیں ۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی ۔ ادھر روتے سسکتے اتنے سارے سال اور محرومیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں کے جان لیوا ستم تھے اور اُدھر ایک ننھا منا چاند تھا، ہنستا مسکراتا ۔ امی ! امی !

وہ چونکیں، پھر بڑے رسان سے، دھیمے سروں میں بولیں :۔

" آپ غلط سمجھ رہے ہیں اشرف بھائی ۔ مجھے زندگی سے اب کوئی گلا نہیں میں نے نورانی کے بچے کو گود لے لیا ہے "

ایک پھول کے لئے رفو پھوپھی سارے بھرے پُرے باغ کو ___ لہلہاتے باغ کو، ہنستے مسکراتے، لہکتے مہکتے باغ کو، ٹھکرا آئیں ۔ اب ان کا دماغ شمو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا، عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے، چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر ۔ اپنا ہو یا پرایا، بس دل کی بات ہے، عورت نے دنیا میں شکست ہمیشہ اس محبت اور ممتا بھرے دل کے ہاتھوں ہی کھائی ہے !

دن ایسے ہی سر سر گزرے جا رہے تھے ۔ اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رفو پھوپھی نے جیسے شمو کو دے ڈالیں، ابھی ابھی وہ گھٹنوں چلتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رفو پھوپھی کو امی کہہ کر پکارا تھا، ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنا بستہ اُٹھایا تھا، اور قاعدہ اُٹھا کر الف بے اور اے، بی، سی، ڈی پڑھا تھا؛ ابھی ابھی اس نے گلابی چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ آکر اپنی امی کو سنایا تھا :۔

" امی امی میں چھٹی کلاس میں فرسٹ آیا ہوں " ابھی ابھی اس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ آکر اُستادوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور ابھی ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس لوٹا تھا ۔ اور بڑے پیار سے اپنی امی سے کہہ رہا تھا :۔

" امی، آپ نہیں سمجھتیں، آپ کی وجہ سے مجھے کتنی فکر لگی رہتی ہے ۔ بھلا کوئی بات بھی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں ؟ کیا میں ایک چائے کی پیالی بھی اپنے ہاتوں

نہیں بنا سکتا۔؟"

رفو پھوپھی مسکرائیں : "بیٹے تو نہیں جانتا، تیرا کام کرکے، تیری ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑھ جاتا ہے۔ آخر ایک ماں اور اپنے بچّے کے لئے کر ہی کیا سکتی ہے!"

اک دم شمو ذرا رُکا اور آہستگی سے بولا :۔ "امی آپ ہی میری امی ہیں نا؟"

رفو پھوپھی نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور بولیں : "کیوں اس میں تجھے کوئی شک ہے؟ وہی چڑیلیں زرینہ، شاہینہ وغیرہ تجھے ستا رہی ہوں گی نا؟"

"نہیں امی، شمو ہنس کر بولا، ویسے تو سب ہی کہتے رہتے ہیں، آج کل سے نہیں بہت زمانے سے کہ آپ میری امی نہیں پھوپھی ہیں۔"

"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے پگلے؟ بہر حال میں تیری ماں تو ہوں نا؟ کیا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے؟"

شمو کا چہرہ اتر سا گیا۔ روہانسا ہو کر بولا :۔

"امی ایسی بات نہ پوچھئے۔ دادی اماں سناتی رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔ رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ، ہر ہر سکھ میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو اور آپ نے اپنی ساری جائداد بھی میرے نام کر دی۔ سچ کبھی کبھار میں خود کو بے حد گناہگار محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا......"

رفو پھوپھی نے اک دم لپک کر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"خدا کے لئے چپ رہ جا شمو۔ ایسی بات کرتے تجھے ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آخر میرے دل کا احساس کر۔ آخر میں کس کے لئے جی...... اور کس کے لئے مروں گی؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

شمو رُکا اور بے بسی سے بولا : "کہنے جیسی بات تو نہیں ہے امی، اگر واقعی آپ اپنی زندگی سنوار بھی سکتی تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

رفو پھوپھی تڑپ اٹھیں : "شمو ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ تمتا رہا تھا اور زندگی کا ہر بیتا لمحہ جیسے ٹھٹھک گیا تھا۔ رک رک کر چمکار چمکار کر کہہ رہا تھا! "سچ کہنا، کیا تمہیں کبھی بھی بیتے دنوں پر افسوس نہیں ہوتا؟ کیا اپنی کھوئی

بھری جوانی کو یوں برباد کر کے تمہیں کوئی گرڈمن نہیں ہوتی ہے؟"

اس رات شمو نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر امی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ننھی ننھی سسکیوں سے لرزتا پایا!

شمیم میاں ایم، بی، بی، ایس کے تھرڈ ایر میں تھے کہ ان کی لیلی بھڑکی۔ اُڑتے اُڑتے یہ بات رفو پھوپی کے کانوں تک بھی آئی۔ رفو پھوپی کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔! انہوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اچھے شریف خاندان کی بے حد پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے، اگن گن کر ان ظلم وستم کا بدلہ لیں گی اور بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پرے آنگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ شمو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ پتہ نہیں اپنے کون سے پروفیسر کی لڑکی پر ریجھ گئے تھے، خاندان کی بات تو جانے ہی دو، بٹیا رانی ابھی میٹرک بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پر دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا جایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفو پھوپی کا واسطہ ہوتا تو شمو میاں کو اتنی لگ لگاہٹ بھی نہ ہوتی، مگر یہاں تو پورے خاندان سے ٹکر لینے کا سوال تھا اور پھر ابھی تعلیم بھی ادھوری تھی اور نوکری کا کوئی ٹھاو ٹھکان ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو اتنا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلاتے تب بھی عمر بھر گھر بیٹھے کھا سکتے تھے، مگر گھر بیٹھا مرد بھی کہیں بھلا لگتا ہے۔

رفو پھوپی لاکھ بے خبر تھیں، مگر چہرے کی اُڑی اُڑی رنگت اور بہکی بہکی چال ڈھال سے بھانپ گئیں کہ شمو میاں نے ضرور کہیں جی اٹکا لیا ہے۔ اِدھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کی، ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پیشی ہوئی تو وہ کفن پھاڑ کر چلّا اٹھیں۔ اور اُلٹے جب رفو پھوپی نے ہی بیٹے کی پشت پناہی کی تو وہ چلّا اٹھیں:

"جائداد کا جبہ جبہ بھی آگے ہی اس کے نام کر دیا ہے۔ اور اوپر سے بہو بھی وہ اونچے خاندان کی لا رہی ہے۔ اری دیکھنا، تجھے دانے دانے کو ترسا دیں گے۔ پتہ نہیں اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ نیچ اونچ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر جیسی عمر ایسی ہی ناسمجھی کو گزار دی۔"

مگر رفو پھوپی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ عشق تو شمو میاں نے کیا تھا، ہجر وفراق کے

اثرات ان کی صورت سے ہویدا تھے۔ رنگ پیلا، اُلجھے سُلجھے بال، ہونق چہرا، کوئی دیکھا تو یہی کہتا اب تب ہو رہی ہیں۔ اس ضد ضدی میں سال بھر نکل گیا، مگر شمو میاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لگن تھی، وہی ایک رٹ، تھک ہار کے بڑے بوڑھے بھی چپ ہو رہے۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پوس ٹکتا بھی کب ہے؟

رفو پھپی نے اپنے جہیز اور چڑھاوے کے سارے جوڑے اور زیور ازیوریوں ہی اُٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جتن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گوٹے کناری پر بنا کپڑا الگوا رہی تھیں اور زیور کے فیشن بدل چلے تھے۔ تو ڈیزائن بدلوانے پر مصر تھیں۔ رہی سہی ساری پونجی اُنھوں نے شادی کے ہنگاموں پر لگادی وہ سچ مچ کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا؟ ان کے سینے میں ماں کا دل تو دھڑکتا تھا! یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے رات رات بھر جاگ کر، روئی کی بتی بنا بنا کر اپنے شمو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ارمانوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوتڑے، رُمالیاں دھوتی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے شمو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات رات بھر کی نیند حرام کر لی تھی۔ یہ وہی تو تھیں نہ جنھوں نے اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ، ہر ہر پیار بھرا لمحہ شمو پر قربان کر دیا تھا۔ کیا ایک ماں اس وقت ماں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلا دے؟ کیا محض اپنے بطن سے جنم دینے والی ہی ماں کہلا سکتی ہے؟ زندگی کی ساری خوشیاں نثار کر دینے والی دکھی روح کو پھر اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا سات آسمانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ اُنھیں ماں پن کی لذّت سے محروم کر دیتا؟

شادی کے دن رفو پھپی کی خوشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں اُنھوں نے ہر ہر کام نپٹایا تھا۔ مہمانوں، رشتہ داروں، دوستوں، نوکروں سے گھر بھرا پڑا تھا مگر وہ ہر ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو شمو نے ان کی پسند سے شادی نہ کی۔ زندگی کسے گزارنی تھی، شمو کو یا اُنھیں؟ یہ تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھ پہچان کر ہاتھ بڑھایا تھا، پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوتیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ بارات بینڈ باجے کے ساتھ دلہن دلہا کو لے کر گھر آئی راستہ بھر آتشبازیاں چھوٹتی رہیں اور رفو پھپی خود اپنے ہاتھوں پیسے لُٹاتی رہیں۔ آج کوئی رفو پھپی

کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں، ان کے پژمردہ اور پیلے چہرے پر آج گلابیاں اُمڈ رہی تھیں۔

دلہن کا کمرہ بھی خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطہ باغ کا گمان ہو رہا تھا مقیش کے تاروں اور چاندی کے پتلے پتلے پھولوں سے مسہری جگ مگ کر رہی تھی۔ چھپر کھٹ پر دلہن سر نہوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھوپھی آتے جاتے، پُر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب کب چاند چڑھے اور یہ کلی پھول بن کر مہکے۔

کھانے دانے اور ریت رسموں سے فارغ ہونے پر جب دولہا کو اوپر لایا گیا تو اچانک رفو پھوپھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑیوں میں سے جھانکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ اداس اداس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن — مسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں کا دن — اور شمو کے چہرے پر پژمردگی ؟ وہ بے کل بے کل سی، بولائی، بولائی سی اِدھر اُدھر پھرنے لگیں، کہ بھیڑ چھٹے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں۔ مگر دلہن دولہا کے آس پاس وہ جھوڑ جھمکا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہمان بیبیاں موقع پا پا کر اپنے جھروکوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور ٹاٹوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چھت خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا، دلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھوپھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئیں اور چھٹتے ہی بولیں :-

"میرے لال! کیا بات ہے؟ چہرہ یوں اُترا اُترا سا کیوں ہے؟"

تسیم صاف ٹال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا۔

"کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں حد سے سوا خوش ہوں۔ آپ جی نہ کڑھایئے۔"

مگر رفو پھوپھی کا جی نہ مانا، وہ گلے کا ہار ہو گئیں، اور قسمیں دے دے کر اس کی اداسی کا سبب پوچھنے لگیں۔ نسیم نے جیسے حلق میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اُتارا اور اٹک اٹک کر بولا :-

"نہیں امی بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں"

"میری اماں!"

"میری اماں !"

"میری اماں !"

رفو پھوپھی کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان، سب گھومنے لگے ۔ تاروں بھرا آسمان چکر کھانے لگا۔ پھولوں بھری زمین چکر کھانے لگی۔

اُنھوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ بے سدھ ہوتی جا رہی تھیں۔ جھٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی محسوس ہوائی۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہوگیا، اور وہ تیورا کر زمیں پر گر پڑیں ......"

اے رُودِ موسیٰ

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ...... ؟!

سترہ سال کی عمر میں مَیں خوبصورتی کا مکمل نمونہ تھی ـــــ میرا جسم متناسب تھا، قد لمبا لمبا، ہاتھ پاؤں صندلیں، آنکھیں شراب کے پیالے ـــــ رنگت ایسی جیسے کسی نے میدہ گلابی پانی سے گوندھ کر رکھ دیا ہو ـــــ تم اگر اسے خود ستائی نہ کہو تو میں یہ کہنے کی جرأت کروں کہ میں نے دنیا میں خود سے زیادہ حسین شکل کوئی نہ دیکھی ـــــ اور میرے اُس حُسن کا مول بھی بہت اونچا تھا۔

میری منگنی شہر کے ایک بہت بڑے رئیس کے ولایت پلٹ لڑکے سے ہو چکی تھی اور اسی لئے بھائی میاں مجھے بڑی سرگرمی سے چھُری کانٹے سے کھانا کھانا سکھا رہے تھے ـــــ کبھی کبھی میں کانٹا زبان میں چبھا لیتی ـــــ یا چھُری اس بے دردی سے ڈبل روٹی پر چلاتی کہ میری انگلی کٹ جاتی۔ اور نتیجے میں بھائی جان میرے سر پر ایک آدھ دھول جڑ دیتے ـــــ اُنھوں نے ہزار بار بڑے پیار سے سمجھایا تھا کہ کانٹے میں اٹکے روٹی یا گوشت کے ٹکڑے کو، دانتوں کی مدد سے بڑی آہستگی سے زبان پر اتار لینا چاہئے، مگر میں اکثر کانٹا اس انداز سے منہ میں رکھتی کہ زبان میں چُبھ چُبھ جاتا ـــــ مگر کانٹے کی یہ چبھن بھی بھلی لگتی ـــــ یہ سب کچھ میں اپنی نئی زندگی میں داخل ہونے کے لئے ہی تو سیکھ رہی تھی نا ـــــ ؟؟

جب بھائی میاں مجھے کھانا کھانا سکھا رہے ہوتے، دالان میں امّاں بیٹھی خشمگیں نگاہوں سے

مجھے گھورے جاتیں۔

جس گھرانے میں میری بات لگی ہوئی تھی، وہ گھرانا بڑا فارورڈ تھا ـــــ وہاں کے سارے طور طریقے بالکل انگریزوں کے سے تھے، اماّں ڈرتی تھیں کہ میں نے اپنی نادانی کی وجہ سے اگر کوئی اُلٹ پلٹ بات کر دی تو اتنا اچھا رشتہ ہاتھوں سے نکل جائے گا ـــــ ! ولایت پلٹ لڑکے بھلا کوئی روز روز ملتے ہیں جی ـــــ ؟ (تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟)

میں سوچتی اماں کے خدشے بھی بے بنیاد تو نہیں ہیں ـــــ کانچ کے نازک اور خوبصورت کھلونے کو کوئی ٹھوکر مار دے تو کیا انجام ہوتا ہے ـــــ ؟ وطن میں ہماری زندگی بھی تو ایسی ہی نازک نازک خوبصورت کانچ کے کھلونے ایسی تھی ـــــ وقت کی مضبوط ٹھوکر پڑی اور کھلونا چکنا چور تھا ـــــ پرانی زندگی کی یاد کو لے کر اب کرنا بھی کیا تھا ـــــ وہ ساری خوشیاں اور ولولے تو سرد پڑ گئے تھے ـــــ اب تو پیٹ کی آگ تھی اور کچھ نہیں ـــــ جسے کسی نہ کسی صورت بجھانا تھا ـــــ ابا راستے میں بلوائیوں کے ہاتھوں مارے گئے اور لُٹ پٹا کر ہم، اماں اور بھائی میاں کسی نہ کسی طرح بچ نکلے ـــــ ان دنوں میں کسقدر ذرا سی تھی ـــــ ؟ پھول کی طرح تازہ ـــــ کانچ کی طرح نازک۔ اماں مجھے اس طرح بچا بچا کر لائی تھیں جیسے مرغی، چیل کو منڈلاتے دیکھ کر اپنے پروں میں اپنے بچوں کو چھپا چھپا لیتی ہے ـــــ میں اماں کے پروں میں دبی دبکی، پتہ نہیں کن کن راستوں سے گزرتی جاتی تھی ـــــ راستے میں کبھی کبھار آنکھیں کھول کر ذرا سا سر اُٹھا کر ریل کی کھڑکی سے باہر جھانکتی تو رات کا پُر اسرار اندھیرا اور سناٹا جیسے میری روح سلب کئے لیتا ـــــ میں گھبرا کر پھر آنکھیں موندھ لیتی۔

زندگی کا پہلا سفر انہی اندھیروں میں کٹا ـــــ شاید اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ جو اجالوں کی چاہ کرتے ہیں۔ انہی کو اندھیرے ملتے ہیں ـــــ اپنے پیچھے ہم کیسی زندگی چھوڑ آئے تھے ـــــ ؟! بھرا پُرا گھر ـــــ ہنستا جھومتا وہ باغ ـــــ پورٹیکو میں ابھی ابھی آ کر کھڑی ہوئی کار ـــــ وہ نیلے رنگ کے پردوں والا ڈرائنگ روم۔ اور ـــــ اور

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ـــــ ؟!)

ہم آگے بڑھ آئے، زندگی وہیں رہ گئی ـــــ میں نے اپنی کتابیں کاپیاں جو میز پر کھول کر رکھی تھیں، شاید ابھی تک کھلی پڑی ہوں ـــــ ! میز کے کنارے میں نے داوات کا ڈھکنا رکھ دیا تھا ـــــ کون جانے وہ وہیں پڑا ہو ـــــ الجبرا کا ایک سوال میں نے ابھی پورا حل بھی نہیں کیا تھا ـــــ سنہری سنہری روشنی میں اپنی میز پر جھکی میں کسقدر لگن اور اشتیاق سے ادھورا سوال حل کر رہی تھی ؟! پھر میں وہ سوال کبھی حل نہ کر سکی، وہ سنہری روشنی وہیں کھو گئی ـــــ شاید داوات لڑھک گئی تھی، تبھی تو سارے میں سیاہی پھیل گئی تھی ـــــ رات کی طرح تاریک اور ڈراؤنی ـــــ پھر سب کچھ

اس سیاہی، اس تاریکی میں ڈوب گیا ــــ مٹ گیا ــــ فنا ہو گیا اور ہم دھیرے دھیرے چوروں کی طرح اپنے ہی گھر سے یوں نکل آئے کہ پیچھے پلٹ کر دیکھ بھی نہ سکے ــــ میں تم سے پوچھتی ہوں اتنے دن گزرنے پر بھی یہ دُکھ جی سے کیوں نہیں جاتا ــــ ماہ و سال کے کندھوں پر رکھا ہوا یہ بوجھ ہلکا کیوں نہیں ہوتا ــــ کیوں نہیں ہوتا ــــ ؟؟ بولو ــــ بولو نا ــــ مگر نہیں ــــ مجھے اس طرح جذباتی نہیں ہونا چاہئے ــــ مجھے آج تم سے کوئی سوال نہیں کرنا ہے ــــ بس تمہیں سب کچھ سُنانا ہے جی کا یہ بوجھ کسی طرح تو ہلکا پڑے ــــ دل کا یہ دُکھڑا کوئی تو سُنے ــــ میرے غم سے بھرے دل کو ایک ہلکی سی مسرّت یہ تو مل جائے کہ کوئی تو تھا جس نے میرا غم بانٹا ــــ ! تمہارا یہ پُرسکون انداز، تمہاری یہ خاموشی بتا رہی ہے کہ واقعی تم غور سے میری باتیں سُن رہے ہو ــــ نا؟!

میں اُلجھے ہوئے دھاگوں میں سرا تلاش کرتے کرتے بھٹک جاتی ہوں ــــ بھول جاتی ہوں کہ میں کیا کہہ رہی تھی ــــ اتنی ساری باتیں اکدم سے زبان کی نوک پر آکر مچلنے لگیں تو کیسے نہ کوئی راہ بھولے؟ کیسے نہ میں ہڑا کھو دوں ــــ ؟

ہم نے اس دیارِ غیر میں قدم رکھا تو کوئی آسرا نہ تھا ــــ کوئی سہارا نہ تھا ــــ بھائی میاں اپنی ادھوری تعلیم کو مکمل کرنا چاہتے تھے، مگر کوئی ذریعہ، کوئی آسرا نہ تھا ــــ وہ ڈاکٹر بننے کا خواب دیکھتے تھے مگر صرف ایف ایس سی پر آکر ان کی گاڑی رُک گئی ــــ میں نے زندگی کے جو سہانے خواب بُنے تھے، سب جہاں کے تہاں رہ گئے ــــ بھائی میاں جوتیاں چٹخاتے سارے شہر کی خاک چھانا کرتے کہ کہیں سے چار پیسے کا آسرا مل جائے اور ادھر میں اور اماں ایک تنگ تاریک سے مکان میں ..... (ایسا مکان، جسے مکان کہنے کو بھی جی نہیں چاہتا) زندگی کی دھوپ چھاؤں کے رنگ دیکھا کرتیں۔ کیا تم سمجھتے ہو ویرانے میں کھلنے والی کلی کبھی پھول نہیں بنتی ــــ ؟؟ میں اسی ویرانے میں کلی سے پھول بننے لگی ــــ اور بچ جانو ایک دن اسی اندھیارے کمرے کی دیواروں نے پہلی بار چاند کی کرنوں کا سامنا کیا !!

بھائی میاں کو چالیس روپیہ ماہانہ کی بہت بڑھیا سی ملازمت مل چکی تھی ۔ جہاں وہ دن بھر مغز پاشی کرتے اور شام کو یوں لوٹتے جیسے ابھی ابھی مر جائیں گے ــــ کاش مر ہی جاتے زمین کی چھاتی پر کا بوجھ کچھ تو کم ہوتا ــــ ! مگر یہ سُنو کہ ہم میں سے کبھی کوئی نہ مرا ــــ دنیا میں غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی کوئی راہ نہیں ــــ کوئی کیا جئے کوئی کیا مرے ۔ معاف کرنا ۔ تم پتہ نہیں ہمارے متعلق کیا سوچو، مگر یہ بات بغیر سنائے میں نہیں رہوں گی کہ حالات کے باوجود میرا ایک اس قدر اعلیٰ گھرانے میں رشتہ طے پا جانا، کس وجہ سے تھا۔ وہ محض ایک سوٹ تھا ــــ ہاں اونی سوٹ ــــ گرے کلر کا ــــ بھلے ہی تم اسے بُرا کہہ لو مگر میں

نہیں کہوں گی ـــــ اگر آدمی کو کھانے کو نہ ملے، پہننے کو نہ ملے تو میں سمجھتی ہوں اُسے ہر عیب کو ہُنر سمجھنا چاہئے ـــــ بھائی میاں کئی دنوں سے ایک جوڑے پر گزارہ کر رہے تھے ـــــ چالیس روپیہ میں کیا ہو سکتا ہے ۔؟ شاید یہ بات تمہاری سمجھ میں نہ آ سکے ۔ مگر ہم تو سمجھ سکتے ہیں نا ـــــ اس دن چکنی کالی لمبی سڑک پر جبکہ کوئی موٹر، سائیکل، بس نہ تھی، اکیلے بھائی میاں چلتے چلے آ رہے تھے اور ان کے آگے آگے ایک خوش پوش جوان ـــــ (ادھ ذرا سوچ، غریبی کسقدر بڑی معلّم ہے ـــــ) بھائی میاں نے جلدی جلدی قدم بڑھائے اور پیچھے سے اس خوش پوش کی گردن پر ایک دھول جمائی ـــــ بھائی میاں ایسے کوئی ظالم تو نہ تھے کہ اسے جان سے مارنے کے بارے میں سوچتے ـــــ وہ تو محض اپنی ضرورت پوری کرنا چاہتے تھے ـــــ تھوڑی دیر بعد جب بھائی میاں اُسی تمکنت اور بھرم سے سڑک پر چل رہے تھے تو ان کے جسم پر وہ قیمتی گرے کلر کا سوٹ تھا اور اس خوش پوش نوجوان کے جسم پر چھیچھڑے لٹک رہے تھے ۔

ہاں تب میں نے جانا کہ لباس قسمتیں بدل دیا کرتا ہے ـــــ بدل سکتا ہے ـــــ دیکھو ہم لوگ غریب ضرور ہیں، مگر اپنا عیب نہیں چھپاتے ـــــ بھائی میں جیت ہے نا ـــــ بس اسی لئے ـــــ رات کو بھائی میاں نے بڑے فخر سے بتایا کہ کس طرح وہ پلک جھپکتے میں ایک قیمتی سوٹ کے مالک بن بیٹھے تھے ۔ اس رات ہم دونوں کتنی دیر تک ہنستے رہے تھے ـــــ ! اُف پوچھو مت ـــــ کیسی خوشی تھی کہ بس ہنسی رکتی نہ تھی ـــــ !

دوسرے دن وہی سوٹ پہن کر بھائی میاں اپنی سروس پر گئے تھے ـــــ اور پھر پتہ ہے کیا ہوا ؟؟ اسے اتفاق بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ قسمت بھی کہہ سکتے ہیں ـــــ بہرحال ہوا یوں کہ جب بھائی میاں اپنی میز پر جھکے قلم چلا رہے تھے تو ان کا باس ان کے پاس آ کھڑا ہوا ـــــ پہلے وہ تو سر سے پاؤں تک ان کو دیکھتا رہا ـــــ دیکھتا رہا ـــــ پھر یوں گھوم پھر کر ان کے گرد پھیرے ڈالے جیسے کوئی قربانی کے لئے بکرا خریدنا چاہتا ہو ـــــ دیکھ لینا چاہتا ہو کہ کوئی کمی تو نہیں ہے، کانا تو نہیں، لنگڑا تو نہیں ہے، بیمار تو نہیں ہے ـــــ بھائی میاں نے سر اُٹھا کر دیکھا اور گھبرا کر سر جھکا لیا ۔

" آجکل تو یہ کپڑا ملتا ہی نہیں ـــــ کہاں سے خریدا مسٹر ـــــ " وہ بہت سادگی سے پوچھ رہا تھا ۔

" جی ـــــ جی ـــــ جی ـــــ " بھائی میاں ہکلا گئے اور بولے " اگر آپ کو یوں ہی بھلا لگتا ہے تو لے لیجئے نا ـــــ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی میری ـــــ " باس مُسکرا کر رہ گیا ـــــ

گھر آ کر پوری روئیداد بھائی میاں نے مجھے بتائی اور یہ بھی کہا کہ اس اہم فرض کو میں ہی انجام دوں ۔ کہ ان کے پاس تک یہ سوٹ پہنچا دوں ۔ اس لمحہ اُن کے چہرے پر چراغ سا جل رہا تھا ـــــ امید کا ہی ہو گا ـــــ !)

پہلے تو بڑی دیر تک حیل حجت ہوتی رہی کہ میرا جانا مناسب ہوگا بھی یا نہیں ــــــ اور جب یہ طے ہوگیا تو یہ مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا کہ میں اتنے بڑے بنگلے پر جاؤں گی تو سہی مگر پہنوں گی کیا ــــــ ؟

تم یوں لمبے لمبے سانس کیوں لے رہے ہو ــــــ ؟ ترل ــــــ ترل ــــــ ترل ــــــ شاید سوچ رہے ہو کہ آگے میں کیا کہوں گی ــــــ ہاں شاید تم یقین نہ کرو کہ زندگی کیا تھی ــــــ کیسی تھی کس کم بخت کے پاس خوشی تھی ــــــ ؟؟ آنسو ہی تو تھے جو ہر موقع پر برس برس کر اندھیروں میں اجالے پیدا کرتے تھے ــــــ خیر ــــــ اس اکلوتی سفید ساڑھی کو جو اماں نے پتہ نہیں کس خیال سے سینت کر رکھی تھی، میں نے اپنے جسم کے گرد لپیٹا ــــــ ! اور تم ایک لمحے کو تو سوچو کہ اس سفید لباس میں میں کیا قیامت ڈھا رہی ہوں گی ــــــ ؟! یہ گال اس وقت مرجھا کر زرد پڑ گئے ہیں تو کیا ہوا ــــــ ؟ یہ لمبے لمبے بال اب دھل سے اَٹ گئے ہیں تو کیا ہوا ــــــ تب تو میں ایسی نہ تھی ــــــ میں تو شبنم میں نہایا ہوا تازہ تازہ پھول تھی، جس کی پنکھڑی پنکھڑی سے رس نتھرتا تھا۔

حُسن اپنی قیمت اپنی بولی اُٹھوانے چلا تھا !

بھائی میاں نے پھاٹک کو ذرا سا دھکا دیا اور ایک بڑے بڑے بالوں والے پیلے رنگ کے کتّے نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا ــــــ بھائی میاں تو مصلحتاً باہر جا کر چھپ گئے اور میں وہیں کاغذ میں تہہ شدہ سوٹ سنبھالے سہمی سی کھڑی رہ گئی ــــــ کتّے کی آواز سن کر پہلے تو چپراسی اور پھر ایک خوبصورت سا جوان آدمی باہر نکل آیا۔

اب میں تم سے یہ نہ بتاؤں گی کہ کتنے لمحے یوں ہی گزر گئے تھے ــــــ نہیں۔ ایک بھی لمحہ نہیں گزرا تھا ــــــ نہیں نہیں ــــــ شاید میں بھول گئی ہوں ــــــ مجھے تو کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ ساری عمر گزر گئی تھی ــــــ ایک صدی سے کم کیا گزری ہوگی ــــــ نہیں شاید وقت ٹھٹھک کر یوں ہی ساکت ہو گیا تھا ــــــ وقت تو مگر کبھی نہیں رکتا نا ــــــ ؟ تو شاید میں ہی بھول رہی ہوں ــــــ !

پھر میں ایک بہت سجے سجائے ڈرائنگ روم میں تھی ــــــ ہمارے دِلّی والے ڈرائنگ روم سے بھی بڑھ چڑھ کر سجا سجایا ــــــ ! تم کیا سمجھتے ہو میں اپنا ماضی بھول گئی ہوں ــــــ بھول سکتی ہوں ــــــ ؟ ارے توبہ کرو ــــــ عورت کے چار آنکھیں ہوتی ہیں ــــــ دو چہرے پر ــــــ دو پیٹھ پہ چہرے پر کی آنکھیں تو سبھوں کو نظر آتی ہیں، مگر وہ جو پیٹھ پر ہوتی ہیں نا وہ کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ صرف عورت انھیں محسوس کرتی اور ان سے ماضی کو، دیکھتی رہتی ہے ــــــ پوجتی رہتی ہے ــــــ مرد کی نگاہ مستقبل پر ہوتی ہے اور عورت ماضی کو دیکھتی، پلٹ پلٹ کر، مڑ مڑ کر، بڑھتی ہے ــــــ میں کیسے اپنا ماضی بھول جاؤں ــــــ بچہ تھی تو کیا ہوا۔ عورت تو تھی ــــــ !

میں سہمے ہوئے پرندے کی طرح صوفے کے کونے میں دبکی بیٹھی تھی اور وہ بچوں کی طرح مجھ

سے بوتا؟ کر رہے تھے ـــــ یہ لو ـــــ وہ لو ـــــ یہ کھاؤ ـــــ وہ چکھو

اتنے میں دروازے کا پردہ ہٹا اور بھائی میاں داخل ہوئے ـــــ اپنے ازلی اور اکلوتے جوڑے میں ملبوس ـــــ میں نے ذرا طنز سے باس کی طرف دیکھا ـــــ "دیکھ لی ہماری حقیقت" میری نگاہیں یہی کچھ کہہ رہی ہوں گی اُس کا مجھے یقین ہے ـــــ کیونکہ اُسی لمحہ میری نگاہوں کو پڑھ کر انہوں نے فوراً بھائی میاں سے کہا تھا۔ ـــــ

"جمیل صاحب ـــــ بات بے ڈھب اور اچانک ہی کہہ رہا ہوں ـــــ مگر کیا آپ اپنی بہن کو میری دلہن بنانا پسند کریں گے ـــــ!"

وہ باس تھے اور بھائی میاں ان کے ماتحت ـــــ شاید کوئی اور موقعہ ہوتا، کوئی دوسرا مخاطب ہوتا، تو ان کے لہجے میں اتنی بے تکلفی اور اندازِ گفتگو اتنا صاف صاف نہ ہوتا ـــــ مگر بھائی میاں تو پاتال میں تھے۔

بھائی میاں اس قدر سراسیمہ اس قدر حیرت زدہ، اس قدر پریشان سے رہ گئے کہ منہ سے کچھ نکلا ہی نہیں ـــــ! بڑی دیر بعد وہ بولنے پر آئے تو پھر بولتے ہی چلے گئے اور ہماری زندگی کی کوئی بات ایسی نہ تھی، جو اُنھوں نے نہ سُنادی ہو ـــــ!

"میں جانتا ہوں ـــــ میں جانتا ہوں ـــــ" وہ سگار کو میز پر تھپک تھپک کر اتنا ہی کہے جا رہے تھے ـــــ

"آپ جانتے ہیں ناہم کتنے غریب ہیں ـــــ آپ کو معلوم ہوگا ناکہ میری بہن صرف ساتویں کلاس پاس ہے ـــــ آپ تو یہ بھی جانتے ہوں گے کہ ہمارے پاس رہنے کو ڈھنگ کا مکان بھی نہیں۔ پہننے کو کپڑے بھی نہیں ـــــ سونے کو بستر بھی نہیں ـــــ اور......"

"اور انھوں نے بات کاٹ دی ـــــ" اور آپ جانتے ہیں کہ میں ایک نواب باپ کا بیٹا ہوں ـــــ اپنا ایک ذاتی بزنس چلائے ہوں، اتنی بڑی دولت کا مالک ہوں ـــــ اتنے بڑے بنگلے میں تنہا رہتا اور تنہا حقدار ہوں ـــــ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ میں محض سیر کے طور پر ہزاروں روپے خرچ کر کے لندن ہو آیا ہوں ـــــ اور آپ اب یہ بھی جان رہے ہیں کہ میں آپ سے آپ کی بہن کا ہاتھ مانگ رہا ہوں ـــــ اور یہ بھی سُنا دوں میں پاگل نہیں ہوں ـــــ آپ سے مذاق بھی نہیں کر رہا ہوں ـــــ آپ کو دھوکا بھی نہیں دے رہا ہوں ـــــ آپ کی بہن سے باقاعدہ شادی کروں گا" وہ رُکے ـــــ آگے بڑھے ـــــ میرے قریب آکر ٹھٹھک گئے اور میرا چہرہ اوپر اُٹھا کر بولے۔

"یہ انسان نہیں ـــــ پری ہے ـــــ اور میں بہت حُسن پرست واقع ہوا ہوں جمیل" اور وہ امید بھری نگاہوں سے بھائی میاں کو دیکھنے لگے۔

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ـــــ ؟؟

ایک انسان، خدا بن کر ہماری زندگی میں آیا اور ہم پر آسمان بن کر چھا گیا !

زندگی کس قدر حسین تھی ـــــ ! کتنی خوشگوار ـــــ کتنی پیاری ـــــ مگر ـــــ مگر کیا انجام بھی اتنا ہی حسین، اتنا ہی خوشگوار، اتنا ہی پیارا ہو سکتا تھا ـــــ ؟

تم بے چین ہو رہے ہو ـــــ ہاں تمہاری ساکن سطح پر یہ کیسی ہلچل ہے ـــــ کیا میری باتوں سے تمہارے دل میں دکھ کی لہریں پیدا ہو رہی ہیں ؟؟

اے رودِ موسیٰ ـــــ ٹھہر جا ـــــ تھم جا ـــــ میری باتیں سُنتا جا ـــــ میرے دل کا درد، اپنے دل میں بھر لے ـــــ میں اس درد کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ نہیں لے جانا چاہتی ـــــ آج اپنی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کا حساب لے کر میں تیرے پاس آئی ہوں

سُن لے میری داستاں ـــــ سُن لے ـــــ سُن لے

زندگی پر چھائے غم کے گہرے بادل جیسے ایکدم چھٹ کر رہ گئے ـــــ زندگی میں سکون اور مسرت آگئی ـــــ یہ ایسی خوشی تھی جس کے بارے میں سوچا بھی نہ جا سکتا تھا ـــــ اماں میرے لئے کتنی پریشان رہا کرتی تھیں ـــــ غریبی اور حسن جہاں ایک جگہ ہو جائیں وہاں آپ ہی آپ جھگڑا کھل جاتا ہے۔ جوانی بہاریں لٹاتی آتی ہے اور پھر کسی سہارے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی ـــــ اب نافۂ مشک کی طرح میری خوشبو گھر سے باہر نکل کر پھیل رہی تھی ـــــ زندگی جس راہ پر جا رہی تھی، اُسے دیکھتے ہوئے اس کے سوا اور سوچا بھی کیا جا سکتا تھا ـــــ ؟ مگر بالکل اس طرح، جیسے کالی رات میں اچانک بجلی چمک جائے ـــــ اسی انداز سے ضیا میری زندگی میں داخل ہو گیا۔

بھائی میاں مجھے سر پہ دھول دھپّے جڑ جڑ کر چھری کانٹے سے کھانا کھانا سکھانے لگے اور اماں مجھے رہ رہ کر گھورنے لگیں کہ میں یہ رشتہ کھو نہ بیٹھوں ـــــ !!

اے موسیٰ کے گہرے پانیو ـــــ اے بے تاب لہرو ـــــ ذرا میرے دل میں آ کر جھانکو۔ اے موسیٰ تیری زندگی تو اسی حیدرآباد میں گزری ہے، یہاں کے چپّے چپّے سے تیری شناسائی ہوگی۔ یہاں کی زندگی کا ہر ہر راز تیرے سینے میں دفن ہوگا ـــــ مجھے یہ تو بتا کیا یہاں ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ، بیٹیوں کے دلوں کا خون کر دیں ـــــ ! دولت کے بل پر اپنی بوڑھی رگوں کے لئے تازہ خون خرید لیں ـــــ کیا یہاں پیسہ ہی سب کچھ ہے ـــــ کیا نیکی، سچائی اور پیار کا کوئی مول نہیں ـــــ کوئی قیمت نہیں ـــــ ؟؟ میں ان اتھل پتھل لہروں سے جواب مانگتی ہوں ـــــ بولو ـــــ بولو ـــــ مگر نہیں ـــــ ـــــ مجھے آج کوئی سوال کرنا نہیں ہے ـــــ مجھے تو آج صرف اپنی داستان سنانی ہے ـــــ یہ دکھ، یہ کرب یہ غم میں اپنے سینے میں نہیں لے جانا چاہتی ہوں ـــــ

میں پھول کی طرح ہلکی ہو جانا چاہتی ہوں ــــــ

اس دن میں اور بھائی میاں ضیا صاحب کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے ــــ وہ خود کہیں باہر گئے ہوئے تھے ــــ بارش زور شور سے ہو رہی تھی اور میں نے سردی سے بچنے کو اپنی ساڑی کا آنچل اپنے کانوں اور سر کے گرد لپیٹ لیا تھا ــــ بیٹھے بیٹھے بھائی میاں نے مجھے دیکھا اور یوں ہی ہنس کر کہا ــــ "مہر ــــ خدا کی قسم تو خطرناک حد تک حسین ہے ــــ کوئی حیرت کی بات نہیں جو..... ضیا صاحب نے تجھے مانگ لیا ــــ مجھے تو فرشتوں کے بارے میں بھی شک کرنا پڑے گا ــــ !"

میں نے ذرا جھینپ کر سر جھکا لیا مگر دوسرے ہی لمحے مجھے پھر سے سر اٹھانا پڑا ــــ کیونکہ دھڑ سے دروازہ کھلا تھا ....

ہم دونوں گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے ــــ وہ ضیا صاحب نہیں تھے، کوئی اور تھا ــــ آنے والے کی نگاہیں جیسے مجھ پر جم کر رہ گئیں تھیں ــــ اور خود میں بھی گھبرا کر بھائی میاں کو دیکھتی تھی، کبھی آنے والے کو ــــ

"آپ کی تعریف ــــ ؟" آخر آنے والے نے بھائی میاں سے مخاطب ہو کر زبان کھولی

"جی میں جمیل ہوں ــــ ضیا صاحب میرے بوس ہیں ــــ اور یہ ــــ یہ میری بہن ــــ مہر"

"سچ مچ مہر ــــ" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور پھر بولا ــــ "اور میں ضیا کا والد ہوں، نواب آصف الدولہ ــــ نام تو سنا ہوگا میرا ــــ ؟" وہ مسکرا کر میری طرف گھوما ــــ "حیدرآباد میں جتنی کوٹھیاں میری ہیں، اتنی شاید ہی کسی نے بنوائی ہوں ــــ اور پھر کوٹھیوں کی کیا بات ہے۔ بزنس وغیرہ بھی چلتے ہی رہتے ہیں ــــ اور ضیا میاں کو جو کام میں نے سونپا ہے وہ بھی بس ..... وہ خود ہی مسکرا کر رک گیا ــــ مگر ہم دونوں میں سے کوئی نہ مسکرایا ــــ پہلی ہی ملاقات میں، آتے ہی ایسی بے سر پیر کا ہانکنا ــــ کچھ عجیب سا لگ رہا تھا ــــ یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہو بھی سکتا ہے ــــ یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے عجیب انداز میں تو کوئی اپنے متعلق نہیں بتاتا ــــ اور حد یہ کہ کسی نے جھوٹوں بھی نہ پوچھا تھا ــــ وہ پھر کہے گیا ــــ

"جب کبھی اپنے بیٹے سے ملنے آتا ہوں تو بس یوں ہی اٹ جھٹ کر چلا جاتا ہوں ــــ نوکروں اور مصاحبوں کے جھگھٹے میں باہر نکلنا مجھے مطلق پسند نہیں ــــ کار بھی خود ہی ڈرائیو کرتا آیا ہوں ــــ پورے ساٹھ ہزار کی ہے ــــ"

یقیناً یہ شخص پاگل ہے ــــ میں نے دل ہی دل میں سوچا ــــ مگر اسے دیکھ کر میں اس قدر سہم گئی تھی کہ کچھ نہ کہہ سکی ــــ !

تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ــــ ؟ ذرا دل لگا کر سنو خدا کی بنائی یہ دنیا کیسی ہے ۔

یہاں بسنے والے کیسے ہیں ــــ تو تم جاننا چاہو گے نا کہ پھر ــــــ ! تو سُنو اس بڈھے نے مجھے بھائی میاں سے مانگ لیا ــــ !

ترل ــــ ترل ــــ ترل ــــ یہ تمہارے سینے میں بے چینی کیسی ؟ شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے ــــ مگر اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ میرے شفیق اور مہربان دوست یہ دنیا ہے، یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے ــــ اور جب بھائی میاں نے انکار کیا تو وہ سانپ پھن اُٹھا۔ اس کے حرم میں شاید مجھ ایسی بے بس روح کی ہی کمی تھی جو وہ مجھ پر ہر حربہ آزمانے تُل گیا ــــ اور پھر انسان نے انسان کے ساتھ، شیطان کی سی چال چلی ــــ

روپیہ ــــ روپیہ روپیہ ــــ اس دنیا میں روپیہ کیا نہیں کر سکتا ــــ ؟؟ کیا نہیں کر سکتا ــــ محبت کی بولی لگوا سکتا ہے ــــ پیار کا نیلام کروا سکتا ہے ــــ بہن کی محبت کو بھوا سکتا ہے ــــ تم جانو دس ہزار روپے معولی چیز تو ہوتے نہیں ــــ بھائی میاں نے مجھے بہکانا شروع کیا۔

" مہرو ــــ تو یہ سوچ زندگی بھر روپوں پر چلے گی ــــ ضیا جو اتنا امیر ہے تو نواب صاحب کی گرد کو بھی نہیں پہونچتا ــــ نواب صاحب آسمان ہیں وہ پاتال ہے ــــ تو تو ملکہ بن کر راج رچے گی ہاں دیکھ انکار نہ کرنا ــــ "

میں کبھی غصہ کو چھپا کر ان کی طرف دیکھتی تو وہ میری سرخ رنگت کو شرم پر محمول کرتے ــــ کیسی بے بسی تھی ــــ ؟ ذرا سوچو نا ــــ

میں یہاں بھائی میاں کو بھی الزام نہیں دوں گی ــــ کیوں دُوں ؟ زندگی سے خوشیاں سمیٹنے کا حق ہر انسان کو ملنا چاہئے ــــ نہیں ملتا تو پھر وہ ٹیڑھے میڑھے راستے پر چلنا شروع کر دیتا ہے بھائی میاں نے اب تک کیسی زندگی گزاری تھی ــــ ؟ ضیا نے صرف مجھے مانگا تھا ــــ میرے دُکھوں کو سمیٹ کر اپنے دل میں چھپانا چاہتا تھا ــــ بھائی میاں کے سکھوں کے لئے اس نے کیا قیمت ادا کی۔ یہ کچھ بھی تو نہیں ــــ اگر یہاں انہیں کوئی فائدہ نظر آیا تو کیا بُرا کیا جو انہوں نے میری زندگی کی بولی اُٹھا دی ــــ ؟؟ یہ دنیا ہے میرے بوڑھے دوست ــــ یہاں ایسا ہی ہونا چاہئے ــــ !

بھائی میاں کے جسم پر اب بہترین کپڑے تھے، رہنے کو خوبصورت سا گھر ــــ اور زندگی کی ہر آسائش مہیّا تھی ــــ ایک دن نواب صاحب نے ہمیں خاص الخاص اپنے دولت کدے پر بلوایا تھا ڈرائنگ روم میں داخل ہو کر جب ہم آگے بڑھے تو ایک لمحے کو میں چکرا گئی ــــ کیا اس قید خانے (وہ خوبصورت ہی سہی) میں مجھے رہنا ہوگا ــــ ؟؟ میں نے گھبرا گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا ــــ میرے خدا ــــ یہاں لوگ کیسے رہ سکتے ہوں گے ــــ ؟ اتنی اونچی اور

ہیبت ناک دیواریں! کس میں بوتا تھا کہ ان کو پھلانگنے کے بارے میں سوچ بھی سکتا ــــ

نرم اور گہرے صوفے میں ایک بیگم بیٹھی ہوئی تھیں ــــــ بڑی رعونت سے دیکھتی ہوئی۔

بھائی میاں نے بڑھکر تعارف کروایا۔

" ان سے ملو مہر ــــ یہ نواب صاحب کی بیگم صاحبہ ہیں ــــ اور یہ میری بہن ہے مہر"

میرا خون جوش کھا گیا ــــ یہ میرا سگا بھائی تھا ــــ میرا ماں جایا۔ جو نواب صاحب کی بیگم سے میرا تعارف کروا رہا تھا ــــ میں نے بھوں بھوں کرکے اس کی طرف دیکھا ــــ مجھے اس کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آئے میں نے خود کو مطمئن کر لیا ــــ ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہی تو ہے ــــ ایسا ہی ہونا چاہئے ــــ اس کے آگے انسان اور سوچ بھی کیا ہے ــــ ؟؟

(تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہونا ــــ ؟)

پتہ نہیں کن کن موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ــــ پھر پردہ اٹھا اور ایک بانکی طرحدار لڑکی کمرے میں داخل ہوئی ــــ پتہ چلا وہ نواب صاحب کی بیٹی تھی، (جو عمر میں مجھ سے بھی بڑی تھی) اس نے لڑکوں کی طرح پتلون اور قمیص پہن رکھی تھی۔ سر کے بال پوڈل کٹ (POODIL CAT) کی شکل میں تھے ــــ وہ مزے میں سگریٹ پھونکے جا رہی تھی اور دھوئیں کے مارے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ یوں تو ہم [illegible] کی زندگی دھوئیں میں ہی گزرتی ہے مگر تم جانو یہ دھواں تو دم گھونٹ دینے کو تلا ہوا تھا اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اور وہ لڑکی اچھلی ــــ اپنے ہونٹوں کا سگریٹ نکال کر اس نے جھٹ اپنی ماں کے منہ میں دے دیا ــــ

"ممّا ــــ تم ذرا اسے اسموک کرو ــــ میں ابھی آتا ہوں ــــ"، ممّا خوشی خوشی سے اسموک کرنے لگیں ــــ!

میں نے لرز کر دیکھا ــــ یہ کیسی تہذیب تھی؟ یہ کیسی زندگی تھی ــــ؟ کیا میں اس ماحول میں جی سکتی تھی ــــ؟؟ میرا سانس رک رک کر چلنے لگا ــــ بھائی میاں لہک لہک کر ہنس ہنس کر سبھوں سے باتیں کئے جا رہے تھے ــــ میں وہاں تھی مگر نہیں تھی ــــ مجھے ہوش آیا تو وہ لڑکا نما لڑکی کہہ رہی تھی ــــ: بلو پپا ایسا اسٹیچو ہم لوگاں میوزیم میں دیکھے تھے نا ــــ؟ اس کا اشارہ میری طرف تھا ــــ!

بھائی میاں نے اپنی بہن کے حسن کی تعریف کو بڑی خوشی دلی اور فخر سے سنا اور سینہ تان کر مجھے دیکھنے لگے ــــ "جیسے اس ماں کا حقدار تو میں ہی ہوں ــــ"

جب ہم باہر نکلے تو میرے قدم اس قدر وزنی ہو رہے تھے کہ مجھ سے چلتے نہ بن رہا تھا ــــ دل دماغ میں اس قدر کشمکش ہو رہی تھی ــــ کیا کروں کیا نہ کروں ــــ؟ اکدم مجھے نواب صاحب کے

جب بڑے ناسمجھ ہو جائیں تو چھوٹے خود بخود سمجھدار ہو جاتے ہیں" ___ میں نے جل کر کہا ___

"بک بک مت کرو ___" وہ گرجے

میں نے ان کی طرف دیکھا

"بک بک تو آپ کر رہے ہیں ___ میں تو ہمیشہ سے ہی خاموش طبیعت ہوں ___"

وہ تیزی سے اُٹھے۔ مگر جانے کیا سوچ کر رُک گئے ___ بولے

"خیر آج نہیں کل تو جانے والی ٹھہری، اس لئے خاموش ہو جاتا ہوں، ورنہ ابھی اس بک بک کا مطلب سمجھا دیتا ___"

میں نے اسی لہجے میں مضبوطی سے کہا ___ میں نے کہہ دیا میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ___ اس سے اچھا تو یہ ہے کہ انسان شیر کے ساتھ اس کے بھٹ میں جا رہے ___"

بھائی میاں میرے قریب آئے اور خونخوار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولے ___

"نہیں کرے گی نواب صاحب سے شادی ___! اور جو تیرے باپ کا گھر بھر دیا ہے نواب صاحب نے ___؟ یہ عیش و آسائش اور کہاں سے مل سکتی ہے ناسمجھ کتیا ___ بھول گئی کیا دو دو دن کے فاقے کرتی تھی، اندھیرے میں سوتی تھی، ننگی پھرتی تھی ___ اب رہنے کو گھر مل گیا ہے ___ پہننے کو ریشم مل گیا اور پیٹ میں تر مال پہنچ گیا تو اینٹھتی ہے حرام زادی ___

تم سُن رہے ہو نا ___؟ یہ میرا بھائی تھا ___ سگا بھائی، جو مجھ سے یہ سب کچھ کہہ رہا تھا ___ میں نے جھلّا کر کہا ___

"مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہئے ___ مجھے اپنی وہی زندگی پسند ہے ___"

"ہے نا فقرنی ___ اپنی اصلیت پر ہی جانے والی ___ مگر اب میں تجھے نہ چھوڑوں گا"

میں اسی تیزی سے نہیں نہیں کہے گئی اور بھائی میاں نے پیر سے جوتا نکال لیا ___ ان کا دم اُلٹ گیا میرا جسم نیلا پڑ گیا ___ اور میں بے سدھ ہو کر فرش پر گر پڑی ___

"دیکھتا ہوں کیسے نہیں کرتی ___" جاتے جاتے وہ پھر سُنا گئے ___

پھر دھیرے دھیرے رات گزرنے لگی ___ میرے نصیبوں کی طرح سیاہ رات آنسوؤں کے ستارے لئے دبے پاؤں، میرے قریب سے گزرنے لگی ___ چوٹوں سے میرا جسم درد کر رہا تھا زخم رس رہے تھے اور چپ کے مارے سر نہ اُٹھتا تھا ___

"بھاگ چل ___ خدا کی اتنی بڑی دنیا میں تیرا کوئی تو ٹھکانا ہوگا۔ یہی وقت ہے ___ دیر نہ کر"

میں نے یہ پکار سُنی اور سر اُٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا ___ زیرو پاور کا بلب بڑی اداس روشنی بکھیر رہا تھا ___ اماں کا کمرہ پرے پرے پر تھا، بھائی میاں کے کمرے سے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی اور وہ اِدھ

کر دہ چہرے اور بڑے بڑے دانتوں کا خیال آگیا اور میں نے طے کر لیا کہ نہیں میں اپنے آپ کو کبھی نہیں بیچوں گی ـــــ کبھی نہیں ـــــ کبھی نہیں ـــــ اس سے موت کیا بُری ہے ـــــ؟

میں نے بڑی ہمت کر کے، شرماتے شرماتے آہستگی سے بھائی میاں سے پوچھا۔

"نواب صاحب کو معلوم نہیں کہ میری شادی ضیا صاحب سے ہونے والی ہے ـــــ؟"

"معلوم کیسے نہیں ہے ـــــ میں نے انھیں پہلے ہی بتا دیا تھا مگر ـــــ وہ بات ادھوری چھوڑ یونہی رُک گئے۔

میں نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا، مگر اسی لمحہ مجھے کوٹ کی جیب سے نوٹ جھانکتے نظر آ گئے ـــــ میں نے سوچا ـــــ ٹھیک ہے ـــــ ٹھیک ہی تو ہے۔ اس کے آگے انسان کچھ نہیں سوچ سکتا ـــــ عقل چٹ ہو جاتی ہے۔

(تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ـــــ؟؟)

گھر پہنچ کر بھائی میاں نے اماں سے میرے پیام کے بارے میں بات کی، اماں بھی راضی جیسی تھیں ـــــ "بیٹیاں تو اپنے گھر میں پھلتی پھولتی ہی بھلی لگتی ہیں اور ایسی بیٹیاں تو کبھی کبھار ہی جنم لیتی ہیں جو ماں باپ کا گھر بھی بھرتی جائیں ـــــ ورنہ بیٹیاں تو سدا گھر ہی خالی کرتی گئیں ہیں۔"

اماں کسی کام سے اُٹھ کر گئیں تو میں نے اپنی ساری ہمت سمیٹی اور مُنہ سے آواز نکالی ـــــ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ وہ بات نہ تھی جو میں کہنے چلی تھی ـــــ میں کچھ بھی بک گئی ـــــ پھر سے میں نے ہمت جمع کی اور سوچا ـــــ یہ تو میری زندگی اور موت کا سوال ہے ـــــ خاموشی سے کچھ نہیں بنے گا ـــــ مجھے کہہ دینا ہی چاہئے ـــــ اور میں نے پھر سے خود کو راضی کیا ـــــ

"بھائی میاں ـــــ" میں دوسری طرف دیکھ رہی تھی ـــــ ان سے نظر ملانے کی ہمت مجھ میں نہ تھی۔ میں نے پھر تھوک نگلا اور بولی ـــــ "بھائی میاں ـــــ"

پھر کچھ اس طرح جیسے لبلبی دبا دینے پر پھٹ سے گولی نکل پڑے، میں بول گئی ـــــ "میں نواب صاحب سے شادی نہیں کروں گی ـــــ"

ـــــ میرے دل پر سے جیسے پہاڑ ہٹ گیا ـــــ بھائی میاں خلاف توقع یوں ہی بیٹھے رہے ـــــ شاید وہ مجھے سوجھ بوجھ کی مہلت دے رہے تھے ـــــ بڑی دیر بعد بولے

"مہر تم ابھی بچی ہو ـــــ"

میں نے تیزی سے کہا ـــــ "بچی ہوتی تو یوں میرا سودا نہ ہوتا ـــــ"

اب کہ انھوں نے چونک کر دیکھا اور خود بھی تیزی سے بولے ـــــ

"بہت سمجھدار ہو گئی ہو ـــــ!"

میں نے دھیرے دھیرے خود کو سنبھال لیا ــــــ اور کسی صورت کھڑی ہو گئی ــــ جسم ٹوٹا جا رہا تھا۔ آنسو بہے جا رہے تھے اور سارا عالم ڈوبتا محسوس ہو رہا تھا ــــــ پھر میں نے دھیرے دھیرے اپنے جسم کو پیروں کے سہارے آگے بڑھانا شروع کیا ــــــ الوداع میری پیاری ماں ــــ الوداع۔ میں نے کمرے کی طرف دیکھا جہاں میری ماں سوئی ہوئی تھی۔ اپنے دل میں کئی اُدھوری حسرتیں لئے ــــ ــــ بیٹے کے بیاہ کی ــــ بیٹی کی ودائی کی، پوتے کھلانے کی، نواسے جھلانے کی ــــ آج یہ سب حسرتیں ہمیشگی کی نیند سو رہی ہیں ــــ میری ماں الوداع ــــ الوداع ــــ

بھائی میاں کے کمرے کی طرف منہ کر کے میں کتنی ہی دیر یوں ہی کھڑی رہی ــــ اے مالک تو نے عورت کے سینے میں اتنا درد کیوں بھر دیا ــــ؟ جو اسے دُکھ دیتا ہے، اُسے ہی پیار کرتی ہے۔ جو اس سے نفرت ــــ کرتا ہے اُسی سے محبت کرتی ہے ــــ تو نے عورت کا دل، بہن کا دل اتنا دردمند کیوں بنایا ــــ؟ الوداع میرے بھیا ــــ الوداع ــــ زخموں کے نشان جب تک میرے جسم پر رہیں گے، پھول بن بن کر مہکیں گے اور تمہاری یاد دلائیں گے ــــ آج تمہارا پیار دولت کے انبار تلے دب گیا ہے مگر کبھی تو تمہیں اس دل کی یاد آئے گی جس کی ایک ایک ادا پر تم دل سے ہنستے تھے، خوش ہوتے تھے پیار کرتے تھے ــــ مسکراتے تھے ــــ الوداع ــــ

دروازے سے سر لگا کر میں کتنی ہی دیر کھڑی رہی ــــ رات آہستہ آہستہ یوں جا رہی تھی جیسے کوئی دلہن میکے سے پہلی بار سسرال کو چلے ــــ! قدموں میں وہی بوجھل پن ــــ دل میں وہی غم ــــ آنکھوں میں وہی ستارے ــــ آج دو دلہنیں اپنے اپنے میکوں سے لوٹ رہی تھیں ــــ اے رات تیرا پیا تو افق کے اس پار تیرا منتظر ہے ــــ تیرا پیا تو سورج کا تلک لئے تیری راہ تک رہا ہے ــــ دیکھتے ہی دیکھتے تو محبت کی دہلیز پر قدم دھر دے گی اور تیری زندگی میں صبح کا نور بھر جائے گا ــــ مگر میں؟ میں کون سے پیا کی منتظر ہوں ــــ؟! میری پیشانی پر کون سے سورج کا تلک جھمکے گا ــــ؟؟ میں کون دیش کو جا رہی ہوں ــــ؟ غم کی ڈھلتی پرچھائیوں کے ساتھ میرے دل میں پیار کی روشنی، امیدوں کی گرمی اور محبت کے پھول کیوں نہیں مہک رہے ہیں ــــ؟ میں کہاں جا رہی ہوں ــــ کہاں ــــ ؟!؟

میں نے ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور پھر آگے بڑھتی چلی گئی ــــ تو سنا تم نے؟ میں گھر سے نکل گئی ــــ اور آج مجھے گھر سے نکلے پانچواں دن ہے ــــ پانچواں ــــ اور ان پانچ دنوں میں زندگی سے جی بھر گیا ہے ــــ ان پانچ دنوں کی کہانی بھی نہیں سنا دوں پھر یہ دل ہلکا ہو جائے گا ــــ پھر مجھے یہ غم نہیں رہے گا کہ دنیا میں کسی نے میری داستانِ غم۔ سُنی کر ایک لمحہ کو ہی سہی، جی ہلکا تو ہو جاتا ــــ! تم میری باتیں غور سے سن تو رہے ہو نا ــــ!

میں گھر سے نکل تو گئی مگر معلوم نہ تھا کہ کہاں جاؤں گی ـــــ کدھر جاؤں گی ـــــ ایک جوان اور خوبصورت عورت کے لئے دنیا میں جگہ ہو بھی کہاں سکتی ہے ـــــ ؟ میں صبح تک چلتی رہی ـــــ جب سورج نے ہر طرف روشنی بکھیرنی شروع کی، میں ایک نل کے پاس کھڑی تھی ـــــ میں نے چلوؤں میں پانی لے لے کر اپنا چہرہ دھویا اور جب گرد آلود بال جھٹکانے لگی تو نل کے پاس کھڑی عورتیں مجھ سے پوچھنے لگیں ـــــ

"کیا تم عورت ہو ـــــ ؟"

میں ہنسنے لگی ـــــ عورت ہوں اسی لئے تو یہ دکھ اٹھانے پڑ رہے ہیں ـــــ میں نے دل میں سوچا ـــــ

میری ہنسی پر وہ اور حیرت زدہ ہوئیں اور آپس میں بولنے لگیں ـــــ "صبح صبح آوارہ روحیں بھٹکا کرتی ہیں ـــــ یہ تو کوئی ہم تم جیسی عورت نہیں معلوم پڑتی جی ـــــ اور وہ اپنے اپنے مٹکے گھڑے اٹھائے گھروں کو بھاگنے لگیں ـــــ مجھے پھر ہنسی آگئی ـــــ آج سارا زمانہ مجھ سے دور بھاگ رہا ہے، میرے دل نے درد کے ساتھ سوچا ـــــ میں نے آواز دی ـــــ "میں روح نہیں ہوں، ایک دکھیا عورت ہوں ـــــ میری بات تو سن لو، میرے دل کا درد تو دیکھ لو ـــــ" مگر وہ پیچھے نہ پلٹیں ـــــ میں ہی آگے بڑھ گئی ـــــ !

میں ادھر ادھر ٹھوکریں کھاتی بڑھتی رہی، چلتی رہی ـــــ ایک آدمی نے مجھے دیکھ کر آنکھ ماری۔ میں دکھ سے مسکرا دی ـــــ عورت کے لئے کہیں جائے فرار نہیں ـــــ یہاں ہر آدمی نواب ہے جو پیسے دے کر عورت کو خرید لینا چاہتا ہے ـــــ میں اس کے قریب پہنچی اور کمزور آواز کی بولی۔

"بھائی صاحب آپ .... ـــــ"

اس نے ذرا غور سے میری صورت دیکھی اور پھر بوکھلا کر پلٹ گیا ـــــ "ہونہہ بھائی صاحب ـــــ !"

دنیا کس قدر گندی جگہ ہے ـــــ دیکھا تم نے ـــــ ! ایک مرد عورت کو آنکھ مار کر اشارہ کر سکتا ہے کہ چل میرے ساتھ ـــــ لیکن عورت اگر اسے بھائی کا ساپوتر رشتہ لگا کر سہارا مانگتی ہے تو وہ ہونہہ کر کر آگے بڑھ جاتا ہے ـــــ

میں نے پھر اپنے بے جان قدم بڑھائے ـــــ اتنے دنوں گھر کی چار دیواری میں بیٹھی رہی چلو آج موقع ہاتھ آیا ہے تو دنیا اور دنیا والوں کو ایک نظر دیکھ تو لوں اور میں پھر ـ چلنے لگی ـ صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے شام اور شام کے بعد رات آئی اور پھر سے میرے زخم جاگنے لگے۔ یہ زندگی کی پہلی رات تھی کہ میں اپنے گھر سے ـــــ اپنی ماں سے، اپنے بھائی سے دور رہ کر سو رہی

تھی ـــــ مگر کہاں ؟! چلتے چلتے میں قبرستان تک آنکلی تھی ـــــ میں نے سوچا ہم جیسوں کا سب سے اچھا گھر تو یہیں بن سکتا ہے ـــــ مگر میں نے کہا نا کہ غریبوں کے لئے جینے کی تو کوئی راہ ہے ہی نہیں، مگر مرنے کی بھی راہ نہیں ـــــ زندگی اپنے بس کی نہیں ـــــ موت بھی بس کی نہیں ـــــ چھوٹی بڑی قبروں کے بیچ میں وہیں لیٹ گئی ـــــ اور کوئی موقعہ ہوتا تو شاید میں ڈر سے لرز لرز جاتی، مگر آج کی بات اور تھی ـــــ پے در پے صدموں اور تنہائیوں نے جیسے ڈر کا احساس ہی چھین لیا تھا اور میں مزے سے یوں قبر کے پہلو بہ پہلو لیٹی تھی جیسے سہاگ رات منا رہی ہوں ـــــ

پھر صبح ہوگئی ـــــ مگر میری زندگی کی صبح کہاں تھی ـــــ ؟ اور کون جانے میرے نصیبوں میں کتنی راتوں کی سیاہی لکھی ہوئی تھی ـــــ !! بھوک سے میری چال ڈگمگا رہی تھی ـــــ آنکھوں میں سیاہ دھبے ناچ رہے تھے اور چکر کے مارے قدم اُٹھانا محال تھا، مگر میں چلی جا رہی تھی ایک جگہ جا کر میں ٹھٹھک گئی ـــــ بہت سارے مرد، بچے اور چند عورتیں کسی کو گھیرے میں لئے کھڑی تھیں، میں نے جگہ بنا کر جھانک کر دیکھا ـــــ گھنگھروؤں کی تال پہ کوئی الھڑ سی عورت چھم چھم ناچ رہی تھی اور کوئی کوئی دل والا آنے دو آنے بھی پھینک دیتا تھا ـــــ !

"ہاں زندگی کا ایک روپ یہ بھی ہے ـــــ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر سوچا اور پھر بہکے بہکے قدم اُٹھانے لگی ـــــ بڑی دیر چلتے رہنے کے بعد آخر میں ایک نیم کے نیچے بیٹھ گئی ـــــ

ـــــ "ناچنا شروع کر دوں ـــــ ؟" میں نے بہت صلاحیت کے ساتھ سوچا ـــــ پھر خیال آیا عورت ہو کر تو زندہ رہنا ہی مصیبت ہے ـــــ دل والے مجھے کب زندہ چھوڑیں گے ـــــ ؟ اس عورت کی بات اور تھی، اُس کے ساتھ اس کا ایک رکھوالا بھی تو تھا ـــــ عورت کے لئے رکھوالے کا وجود بھی کس قدر ضروری ہے ـــــ ؟ بغیر سہارے کے تو یہاں پتہ بھی نہیں ہل سکتا ـــــ

ـــــ اُف ـــــ میں کس قدر نیچ ہوگئی ہوں ـــــ ! سڑکوں پر ناچنا ـــــ ؟ بھلا کس نے ایسی ذلیل بات سوچی بھی ہوگی ـــــ ! اُف یہ پیٹ !! ـــــ

بھوک کا شدید احساس پھر سے جاگنے لگا اور میں للچائی ہوئی نگاہوں سے اُس فقیر کو دیکھنے لگی جو ابھی ابھی پتے کے دونے میں سالن لئے چپڑ چپڑ روٹی سے کھا رہا تھا۔ ـــــ میں نے بہت دیر تک اُسے دیکھا ـــــ مگر اس نے میرا کوئی نوٹس نہ لیا۔ شاید وہ صورت سے مجھے کوئی بہت امیر کبیر لڑکی سمجھ رہا ہوگا ـــــ بڑی دیر بعد میں نے کچھ اس انداز میں جیسے اپنے آپ سے مخاطب ہوں، کہنا شروع کیا ـــــ (مگر در اصل میں اس فقیر سے مخاطب تھی) ـــــ

"میں بڑی دکھیا ہوں .... ـــــ

اُس نے ایک لمحے کو تو حیرت سے میری طرف دیکھا، پھر دوسرے ہی لمحے ٹانگیں جھاڑتا ہوا یہ کہہ کر چل دیا ـــــ "او نہ یہاں سبھی دکھی ہیں ـــــ کون کس کا دکھ سنتا پھرے ـــــ"

میں اس جگہ گئی جہاں وہ بیٹھا تھا ـــــ روٹی کے چند ٹکڑے اِدھر اُدھر گرگئے تھے، میں نے جلدی جلدی ہاتھ مار کر سمیٹے اور ندیدوں کی طرح منہ میں بھرنے لگی

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہو نا ـــــ ؟؟ ہاں ہاں یہ میں تھی میں ـــــ جو ایک فقیر کے آگے کے ٹکڑے چُن چُن کر کھا رہی تھی ـــــ مگر مجھے اب حیرت نہیں ہوتی، کیوں کہ اس دنیا میں رہ کر میں نے جانا ہے کہ انسان کو ذلیل کروانے والا یہ پیٹ ہی ہوتا ہے ـــــ خالی پیٹ ـــــ اور یہ نہ بھولو کہ اُس لمحہ میرا پیٹ بھی خالی تھا ـــــ

یہ دوسرا دن تھا جو میں گھر سے الگ تھی ـــــ چند ٹکڑے کھا کر میری آگ اور بھڑک گئی۔

پتہ نہیں کیا جی چاہ رہا تھا ـــــ کسے کھاوں ـــــ کسے پھاڑ ڈالوں ـــــ میں دیوانوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتی بڑھی۔ ایک جگہ کچرے کے ڈبے کے پاس کیلے کے چھلکے پڑے تھے۔ میں نے بغیر کسی تکلف یا شرم کے وہ چھلکے اُٹھائے اور جلدی جلدی منہ چلانے لگی ـــــ اب میں پھر اسی نیم تلے آبیٹھی تھی اور راہ گیر مجھے آتے جاتے بڑی شوق بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے ـــــ ایک موٹے سے سیٹھ نے مجھے حد درجہ مکروہ انداز میں آنکھ مار کر دیکھا ـــــ میں نے متزلزل ہو کر اسے دیکھا ـــــ پارسائی اور بے حیائی میں بڑی کشمکش ہو رہی تھی ـــــ کوئی ادھر کھینچ لیتا، کوئی اُدھر ـــــ میں بیچ میں ادھ مری سی بیٹھی تھی۔

چھی چھی چھی ـــــ یہ میں کیا سوچنے لگی ـــــ کیا میں اتنی نیچ تھی ـــــ ؟؟ کیا زندہ رہنا ایسا ہی ضروری ہے ـــــ ؟؟ کیا پیٹ کے لئے انسان اتنا بھی نیچ ہو جاتا ہے ـــــ پھر کیا یہ تم سوچ رہی ہو تم ـــــ تم خاندانی روایات بھول گئیں ـــــ دلّی کی تمہاری شاندار حویلی ـــــ تمہارے گھرانے کی وہ عزّت ـــــ تمہاری وہ لوگوں کے لئے قابلِ تقلید زندگی ـــــ اب تم اپنا جسم بیچو گی ـــــ ؟؟ ہر رات ایک نئی سیج سجا کر، نئے نئے مردوں کے ساتھ سویا کرو گی ـــــ ؟؟ میں نے اپنے کانوں میں اپنی انگلیاں بھرلیں ـــــ

"نہیں نہیں میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا بھی نہیں ـــــ میں سوچ بھی نہیں سکتی، بند کرو یہ بکواس ـــــ"

اور پھر سب کچھ جیسے ساکت ہو گیا ـــــ بیٹھے بیٹھے ہی جانے کتنے جگ بیت چلے۔ مگر وہ تصور کی دنیا تھی ـــــ حقیقت تو یہ تھی کہ صرف سہ پہر کا وقت بیت رہا تھا اور دھوپیں ترچھی ہو رہی تھیں ـــــ میں بلا کسی ارادے اور مقصد کے یوں ہی بے دلی سے اُٹھی اور چلنے لگی۔ رُکی تو میں ایک ہاسپٹل کے سامنے تھی ـــــ مریضوں کے رشتے دار آجا رہے تھے اور کسی کو اتنی فرصت

نہ تھی کہ دو گھڑی کو رک کر میرا حال بھی پوچھ لیتا ـــــ اب دل برداشت کی حد سے اس طرح باہر ہو رہا تھا کہ جی چاہتا تھا چلّا چلّا کر ساری دنیا کو سنا دوں ـــــ دیکھو میرے دل کے گھاؤ ـــــ میں وہ بدنصیب لڑکی ہوں جسے اس کے سگے بھائی نے بیچ دیا ـــــ دیکھو روپے کی طاقت کیسی ہوتی ہے کہ ماں جایا ایک بہن کے جسم سے خون کے وڑائے اڑا دیتا ہے اور یہ پیٹ کی آگ......

مگر کوئی نہ تھا ـــــ کوئی نہ تھا ـــــ چپراسی نے مجھے وہاں رکا دیکھ کر پوچھا ـــــ

"اے لڑکی ـــــ تم وہاں کیوں کھڑی ہو ـــــ"

میں نے خوشی خوشی زبان کھولی ـــــ "بابا ـــــ میرا اس دنیا میں اب......

"یہاں ہم لوگوں کے دکھڑے سننے نہیں کھڑے جی ـــــ ہسپتال میں جانا ہے تو جاؤ۔ ورنہ راستہ چھوڑ دو موٹریں آ رہی ہیں ـــــ"

تو یہاں کوئی نہیں ـــــ جو کسی بے کس کی ہائے ہی سن لے ـــــ یہ کیسی دنیا ہے مولا تیری ـــــ یہ کیسی زندگی ہے خداوندا ـــــ؟ میں وہیں پرے ہٹ کر ایک کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی ـــــ

میری زندگی میں آوارگی کا کوئی گزر نہ تھا ـــــ ورنہ ممکن تھا کہ میں بھی اپنے لئے کوئی راستہ ڈھونڈ ہی لیتی ـــــ مگر میں نے تم سے بتایا نا کہ میں ایک شریف اور اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ ـــــ بدچلنی کا میرے پاس ایک سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ـــــ اپنا جسم بیچ کر اپنے دوزخ کی آگ بجھانا ـــــ اس فلسفے کو ماننے کی میرے دل میں تاب نہیں ـــــ

میں پھر چلنے لگی ـــــ چلتے چلتے میں شہر کے پُر رونق بازار میں آ گئی ـــــ ہر طرف رنگ و بو کا سیلاب تھا۔ موٹریں اڑ رہی تھیں، عورتیں زرق برق کپڑے پہنے اتراتی پھر رہی تھیں ـــــ آدمیوں کا ہجوم تھا کہ بس چلا جا رہا تھا ـــــ ایک دریا کی مانند رواں دواں ـــــ میرے دیکھتے ہی دیکھتے دو چار موٹریں رکیں، اسی طرح کھمبوں کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی عورتوں کو اشارے سے پاس بلایا گیا اور موٹر زوں زوں یہ جا وہ جا ـــــ

"بیٹھ جاؤں میں بھی کسی موٹر میں ـــــ؟ میں نے دل سے سرگوشی کی ؟چھی چھی ـــــ ایسا سوچنا بھی پاپ ہے ـــــ یہاں تو میں بس اس لئے کھڑی ہوں کہ زندگی کا تماشہ دیکھوں ـــــ میں جانے کب تک تماشہ دیکھتی رہتی کہ ایکدم کسی نے میرا کندھا تھپ تھپا کر کہا

"کیا آپ چند لمحے میرے ساتھ گزار سکتی ہیں ـــــ؟"

میں نے لرز کر دیکھا ـــــ ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا ـــــ نیلے سرج کے سوٹ میں ملبوس سر کے بالوں میں اکا دکا سفید بال بھی چمک رہا تھا ـــــ اونچا قد اور چہرے پر عجب بے کسی چھائی

ہوئی ــــ میں نے پھر اُسے غور سے دیکھا۔ اس کے تیور آوارہ گردوں کے سے نہ تھے ــــ
بھی مصیبت زدہ سا دکھائی دے رہا تھا ــــ

"میں آپ ہی سے مخاطب ہوں ــــ" وہ بڑی شائستگی سے بولا ــــ کیا آپ
لمحوں کے لئے چل کر اس ہوٹل میں میرے ساتھ بیٹھ سکیں گی ــــ؟"

میں نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا اور جدھر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا تھا، ادھر چل
ــــ ہم دونوں ایک ہوٹل میں داخل ہو گئے اور اس نے آگے بڑھ کر میرے لئے ایک کرسی کھ
لیا اور خود بھی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا ــــ

زندگی کا یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی ہوٹل میں آئی تھی ــــ میں حیران حیران نگاہوں سے
اُدھر دیکھ رہی تھی ــــ چھت پر بجلی کے پنکھے چل رہے تھے ــــ سارے میں کپوں اور پ
کی کھڑکھڑ ہو رہی تھی ــــ سگریٹ اور سگار کے دھوئیں بگولے کھا رہے تھے اور ٹھنڈی
میں یہ سب کچھ عجیب خواب کی سی بات لگ رہی تھی ــــ ہمارے اطراف چند مرد بیٹھے
گپیوں میں مصروف تھے ــــ جیسے ہی انھوں نے مجھے دیکھا مُسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے
شاید میرے کپڑوں کی ہنسی اُڑا رہے ہوں! ــــ میں نے دل میں سوچا اور گھبرا کر
جھکالیں ــــ

ــــ اس شخص نے بوائے کو جانے کیا کیا ااَ بلا لانے کا حکم دیدیا تھا اور اب میز لدی ہوئی تھ
اور میری آنکھوں میں جیسے ستارے ناچ رہے تھے ــــ اس نے محض "کھائیے ـ لیجئے نا"
اور میں جیسے پل پڑی ــــ

وہ دھیمے سُروں میں گویا ہوا ــــ

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ــــ"

اس لئے اس جملے پر مجھے اپنے سارے دُکھ یاد آ گئے ــــ میرا تیزی سے کام کرتا ہاتھ
گیا اور میں بے بسی سے بولی ــــ

میں بہت بدنصیب لڑکی ہوں ــــ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ میں کن مصیبتوں میں گھری ہو
ــــ اس نے میری بات یوں ہی کاٹ دی ــــ

"آپ اپنے دُکھ ایک لمحے کو اپنے ہی دل میں محفوظ رکھئے، پہلے میری بات سُنئے ــ
مگر میں اُس کی بات نہیں سُن رہی تھی ــــ کوئی بھی ایسا دل والا نہیں ملتا جو
غم نصیب کے دُکھ کو اپنے سینے میں منتقل کرلے ۔ وہ مجھے مخاطب کرکے کہنے لگا ــــ

"آپ جانتی ہیں میں آپ کو یہاں کس لئے لایا ہوں ــــ" آپ جیسی

ت گزارنے تو بہت سے مزے لے جاتے ہوں گے مگر ــــــ مگر اس کے بعد مَیں نے کچھ :
نا ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ آپ جیسی عورتیں ـــــ

ہوٹل میں جیسے طوفان آگیا تھا ـــــ بادلوں کی گرج اور جہازوں کی کھڑکھڑاہٹ سے
بھی بڑھ کر کوئی گونج گرج تھی جو مجھے ہلا رہی تھی ۔ تعاقب آ رہی تھی ـــــ

ـــــ آپ جیسی عورتیں
آپ جیسی عورتیں ـــــ

میں نے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لیے اور تیزی سے اُٹھ بھاگی ـــــ بھاگتے بھاگتے میز سے دو تین طشتریاں اور کپ لڑھک گئے اور برتنوں کے شور اور قہقہوں کی گونج میں، میں بھاگتی ہی چلی گئی ۔

ـــــ باہر آکر میں نے لمبی سانس لی ـــــ

یہ میری پارسائی کا انعام تھا ـــــ یہ میری ریاضت اور پاکیزگی کا صلہ تھا ـــــ یہ دنیا ـــــ جہاں دلوں کا درد کوئی نہیں دیکھتا ـــــ تسلّی کے دو بول کوئی نہیں کہتا مگر جہاں الزام خوب تراشے جاتے ہیں ـــــ عزّتیں خوب لوٹی جاتی ہیں ـــــ کہاں جاؤں ـــــ ! کہاں جاؤں ـــــ میں نے بے بسی سے آسمان کی طرف دیکھا ـــــ آسمان روشن تھا ۔ پاس پاس ستاروں کے گچھے چمک رہے تھے ـــــ اور ان سبھوں کے بیچ میں چاند تھا جو تیرتا چلا جا رہا تھا ـــــ ـــــ اپنی منزل کی طرف ـــــ

" مجھے بھی روشنی دیدے ـــــ مجھے بھی اُجالے دیدے ـــــ " میں دل کو تھام کر بے بسی سے بولی ـــــ میں بھی اپنی منزل کو جانا چاہتی ہوں ـــــ مجھے روشنی چاہئے ـــــ مجھے زندگی چاہئے ـــــ ۔

اور میں وہیں گھٹنوں میں سر دبائے بیٹھ گئی ـــــ اور پھر میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے میں زمین پر گری جا رہی ہوں ـــــ میرے کانوں میں شور کی آوازیں اور راہگیروں کے قہقہے ہلکے اور ہلکے ـــــ اور ہلکے ہوتے جا رہے ہیں ـــــ میرے سامنے ہسپتال کی بلند و بالا دیواریں تھیں اور ـــــ پھر کچھ یاد نہیں کہ کیا ہوا ـــــ

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو بستر پر پایا ـــــ میں ہسپتال کے بستر پر پڑی ہوئی تھی ۔ سفید سفید لباس پہنے ٹک ٹک کرتی نرسیں اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر آ جا رہی تھیں ۔ اسٹیتھسکوپ گلے میں ڈالے ڈاکٹر، مریضوں پر مہربان نظریں ڈالتے ہوئے آ جا رہے تھے ـــــ ایک نرس قریب سے گزری تو میں نے پوچھا ـــــ

" مجھے یہاں کس نے لاکر ڈال دیا ہے ـــــ ؟ "

نرس اُٹک کر بولی ـــــ "ہمارے کو نہیں معلوم ـــــ مریضوں کو اُدھر سے اڈمٹ کرتے ـــــ کوئی تمہارے بھائی بند ہی لاکر ڈالے ہوں گے ـــــ "

"میرا بھائی بند ـــــ ! ہونہہ ! ایک زہرخند مسکراہٹ میرے لبوں پر پھیل گئی ـــــ

دو دن میں نے ہاسپٹل میں کاٹے ـــــ نرسیں مشین کی طرح مصروف رہتیں ڈاکٹر ٹائم سے آتے اور جلدی جلدی چلے جاتے ـــــ بازو کے بیڈ والے پیشنٹ کو اپنی ہائے ہائے سے فرصت نہ تھی ـــــ پورا وارڈ ہی آہوں اور کراہوں کا مسکن تھا ـــــ کون کس کا دکھ سننے چلا تھا ـــــ

ایک دن میں نے ڈاکٹر کے کوٹ کا دامن تھام ہی لیا ـــــ "ڈاکٹر صاحب میرے دل میں ہر دم ایک آگ سی لگی رہتی ہے ـــــ ! اس آگ کو بجھانے کی کوئی صورت بھی ہے ـــــ ؟

ڈاکٹر صاحب نے نرس کو آواز دی ـــــ "سسٹر ـــــ ٹمپریچر لو ـــــ دماغ پر گرمی کا اثر معلوم ہوتا ہے ـــــ بڑ رہی ہے ـــــ " میں نے تکیئے پر سر پٹخ دیا ـــــ "میں پاگل نہیں ہوں ـــــ میرے دماغ پر گرمی نہیں ہے ـــــ میں سب کچھ سوچ سمجھ سکتی ہوں ـــــ سب جانتی بوجھتی ہوں، مگر میں کہتی ہوں کوئی مجھ سے کبھی ہمدردی بھی جتائے گا یا میں یوں ہی مر جاؤں گی ـــــ ؟

ـــــ نرس نے آکر لال شال سر سے پیر تک اڑھا دی ـــــ

"اتنا پکار امت کرو بی بی ـــــ دوسرے پیشنٹ جاگ جائیں گے ـــــ " اور وہ میرے منہ میں تھرما میٹر کی نلکی دے کر چلی گئی ـــــ

میں نے تھرمامیٹر منہ سے نکال کر رکھ دیا اور جب نرس آئی تو اس سے بڑی لجاہت سے بولی۔

ـــــ "مجھے کھانا چاہئے۔ بھوک لگ رہی ہے ـــــ "

"اتنے بخار میں کھانا نہیں دیا کرتے ـــــ چین سے سو جاؤ ـــــ اُٹھنے کے بعد دودھ پی لینا ـــــ موسمبی یہ رکھی ہے ـــــ " اور وہ بیزبڑاتی چلی گئی

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا ـــــ ڈاکٹروں کی راونڈ کا ٹائم ختم ہو چکا تھا۔ نرسیں اپنے اپنے کاموں میں تھیں ـــــ مریض بستروں پہ پڑے ہائے وائے کر رہے تھے۔ پورے وارڈ میں عجیب سناٹا پھیلا ہوا تھا ـــــ کیسی غیر دلچسپ زندگی ہے خدایا۔ دو ایک دن میں ڈسچارج ہو جاؤں گی ـــــ پھر وہی زندگی اور وہی زندگی کے ستم ! یہ دو دن کا آرام بھی کون بھلا لگ رہا ہے مجھے ـــــ ؟ میں نے بڑے بڑے موسمبی کھائی اور دھیرے دھیرے اپنے جسم کو اُٹھ بیٹھنے پر آمادہ کیا

بڑے سے وارڈ میں سے ہلکے ہلکے قدم اُٹھاتی میں باہر نکل آئی ــــ دروازے پر چپراسی نے پوچھا ــــ

"کہاں جا رہی ہو ــــ"

"گھر ــــ" میں ایک ہی لفظ بول سکی ــــ اور اس ایک لفظ نے پھر میرے دل میں غم ہی غم بھر دیا ــــ

وہ غیر یقینی انداز میں بولا ــــ "مگر ٹکٹ کہاں ہے ــــ؟"

میں چڑ کر بولی ــــ "تو کیا میں یوں ہی بھاگی جا رہی ہوں ــــ؟"

میرے لہجے سے وہ ذرا سہم گیا اور وہ باز وہٹ گیا ــــ میں دھیرے دھیرے ہسپتال کے گیٹ سے باہر نکل گئی ــــ

اور آج پانچواں دن ہے کہ میں گھر سے باہر ہوں ــــ اس گھر سے بھی جہاں میں اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور اُس گھر سے بھی جہاں تصوّر ہی میں سہی مگر میں اپنے شوہر اور چھ بچوں کے ساتھ سکون سے رہتی تھی ــــ گھر جس کی لال اینٹوں کی دیواریں تھیں اور جس کے پھاٹک پر بوگین ویلیا کے ترمزی رنگ کے پھول، ہرے ہرے پتّوں میں چھپے مسکراتے جھومتے تھے ــــ!

تم میری باتیں غور سے سُن تو رہے ہونا ــــ؟!

وہی حیدر آباد کی سڑکیں تھیں ــــ وہی راہگیر ــــ وہی چہل پہل ــــ اور وہی میں، جس کا دل قبرستان تھا ــــ جہاں کئی آرزوئیں پہلو بہ پہلو سو رہی تھیں ــــ جنھیں خدا کا ہاتھ بھی زندہ نہیں کر سکتا تھا ــــ!

میں بھوک سے نڈھال تھی۔ میرا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا ــــ میری ساڑھی دھول اور گرد سے اٹ گئی تھی، میرا دل دُکھی تھا، جسم بے جان اور میرے اُس پاس مکروہ چہرے تھے اور بھوکی نگاہیں ــــ دل جیسے بار بار سُجھاتا تھا ــــ

ایک راستہ ہے ــــ ایک ہی راستہ ہے ــــ چل پڑو ــــ چل پڑو ــــ پھر نہ دُکھ ہوں گے نہ غم ــــ بس خوشیاں ہی خوشیاں ــــ ہاں ایک ہی راستہ ہے۔

ــــ کیا اس راستے کے علاوہ اور کوئی راہ نہیں ہے ــــ؟! کیا دنیا میں ایک بے سہارا عورت کے لئے سوائے چکلے کے اور کوئی ٹھکانا نہیں ہے ــــ! کیا سارے راستے اسی منزل پر آ کر ختم ہوتے ہیں ــــ؟؟

اور یونہی قدم اُٹھاتے اُٹھاتے میں تم تک آ پہنچی ــــ اور جیسے میرے دل میں ایک ساتھ کئی چراغ جل اٹھے۔ ــــ

۔۔ ارے مجھے پتہ ہی نہ تھا ـــــ تم سے بڑھ کر اور کون منزل ہو سکتی ہے ـــــ ؟ تم
نے کتنوں کو سہارا دیا ہے ـــــ ؟ کتنوں کے غموں کی پردہ پوشی کی ہے، کتنی آنکھوں کی فریادیں
سُنی ہیں ـــ کتنے دکھوں کو اپنے دل میں جگہ دی ہے میں ـــــ میں بھی تو اسی درد کی
ماری ہوں ـــــ مجھے بھی تو یہاں پناہ مل سکتی ہے نا ـــ !! اے دریائے موسیٰ ـــــ
ـــــ اے مہربان !

میں نے اپنے گرد آلود پاؤں پانی میں ڈال دیئے اور تم سے باتیں کرنے لگی ـــــ انسانوں کے
دلوں سے اچھا تو تمہارا دل ہے ـــــ تم میری پکار اور غم زدہ آواز سُن کر بھاگے نہیں ـــ ورنہ
یہاں کون کسی کا دُکھ سمیٹتا ہے ۔ تم اسی متانت اور سکون سے بہہ رہے ہو ـــــ تمہارے دل میں
ساروں کے غم سمیٹ کر بھر لینے کی وسعت ہے ـــــ اوروں کی طرح تم نے بے زار ہو کر منہ نہیں
پھیرا، ہاتھ نہیں جھٹکا، طعنے نہیں دیئے اور غور سے میری باتیں سُنتے رہے ـــــ

کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں ـــــ ہاں ایسی اوٹ پٹانگ باتیں
بس خواب میں ہی تو نظر آتی ہیں ـــــ رستی بستی زندگیاں اور کیسے اجڑا کرتی ہیں ـــــ ؟؟ تمہارا یہ
سکون ـــــ تمہاری یہ خاموشی ـــــ کیا سچ تم نے میری باتیں غور سے سُنی ہیں ـــــ ؟! ہاں
ہاں سُنی ہیں، تبھی تو میرے دل کا بوجھ اب ٹل گیا ہے ـــــ میں ہوا کی طرح ہلکی ہو گئی ہوں ـــــ
تمہارے دل کا سکون میرے اپنے دل میں رچ بس گیا ہے اور میں اب مرتے مرتے کس قدر مطمئن ہوں۔
ـــــ کس قدر خوش ـــــ !

کیسی بے نہ کتنے گمنا، کس قدر بزدل اور ڈرپوک تھی جو یوں دنیا سے منہ پھیر لیا ـــــ ذرا دل
پر ہاتھ رکھ کر بتاؤ کہ مجھ ایسی لڑکی کے لئے آج کی ترقی یافتہ دنیا میں اور کون راستہ تھا ـــ ؟! اور
کون منزل ہو سکتی تھی ـــــ ؟؛ میں نے تو بہت سوچ سمجھ کر یہ قدم اُٹھایا ہے ـــــ اور میں
اب کس قدر خوش ہوں ـــــ میں اب دھیرے دھیرے پانی میں اُتر رہی ہوں ـــــ ٹھنڈا
ٹھنڈا پانی میرے جسم کو چھو رہا ہے ـــــ اور میں زندگی سے قریب ـــــ اور قریب
ـــــ اور قریب ہوتی جا رہی ہوں ـــــ